القاسم اکیڈمی کی، ادبی اور تاریخی پیشکش

سُراغِ زندگی

تالیف مولانا عبدالقیوم حقانی

معلومات کا ذخیرہ، تجربوں کی تجوریاں، مطالعہ کی وسعتیں، مشاہدات کے خزانے، نظریات کی اُمنگیں، تصوّرات کے سانچے، خیالات وعزائم کی پُختگیاں، مربیوں کا حلقہ، محسنوں کی جماعت، کتابوں کی صحبتیں، منتخب حضرات جن میں عالم، دانشور، سیاست دان، مدبر، مصنف، معلم، تاریخ ساز اور تاریخ دان، الغرض، سبھی قسم کے لوگوں کا ساتھ رہے گا

القاسم اکیڈمی ● جامعہ ابوھریرہ

خالق آباد ● ضلع نوشہرہ ● سرحد۔پاکستان

القاسم اکیڈمی کی، ادبی اور تاریخی پیشکش

سُراغِ زِندگی

تالیف

مولانا عبدالقیوم حقانی

معلومات کا ذخیرہ، تجربوں کی تجوریاں، مطالعہ کی وسعتیں، مشاہدات کے خزانے، نظریات کی انگیٹھیں، تصورات کی سانچے، خیالات و عزائم کی پختگیاں، مربیوں کا حلقہ، محسنوں کی جماعت، کتابوں کی صحبتیں، منتخب حضرات جن میں عالم، دانشور، سیاست دان، مدبر، مصنف، معلم، تاریخ ساز اور تاریخ دان، الغرض سبھی قسم کے لوگوں کا ساتھ رہے گا۔

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، نوشہرہ، سرحد، پاکستان

جملہ حقوق بحق القاسم اکیڈمی محفوظ ہیں

نام کتاب ..... سُراغِ زندگی

تصنیف ..... مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت ..... 160 صفحات

کمپوزنگ ..... جان محمد جانؔ رُکن القاسم اکیڈمی

تعداد 1100

تاریخ طباعت بارِ چہارم ..... صفر المظفر ۱۴۳۰ھ / فروری 2009ء

ناشر ..... القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ

ملنے کے پتے

☆ صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس النظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک کراچی

☆ مولانا سید محمد حقانی ' مدرس جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، ضلع نوشہرہ

☆ مکتبہ رشیدیہ، سردار پلازہ، اکوڑہ خٹک، ضلع نوشہرہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ ' مدینہ کلاتھ مارکیٹ ' راجہ بازار ' راولپنڈی

☆ مکتبہ سید احمد شہید ' ۱۱۰ الکریم مارکیٹ ' اردو بازار ' لاہور

☆ زم زم پبلشرز ' نزد مقدس مسجد ' اردو بازار ' کراچی

☆ مولانا خلیل الرحمٰن راشدی صاحب، جامعہ ابوہریرہ، چنوں موم ضلع سیالکوٹ

اس کے علاوہ پشاور کے ہر کتب خانہ میں یہ کتاب دستیاب ہے

آئینہ کتاب

آغاز گفتگو	.....	۹
تحصیل علم وعبادت یا پیدائش دولت	.....	۱۳
نو واردان علم وعرفان کی خدمت میں	.....	۱۵
کامیاب زندگی مستقل نظام عمل	.....	۱۶
نفس وجذبات کی آزمائش	.....	۱۹
مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک ایمان افروز مکتوب	.....	۱۹
ذوق علم اور شوق مطالعہ	.....	۲۴
علم کی حقیقت	.....	۲۴
علم وعمل حسب ونسب	.....	۲۴
فقہ بغیر علم کے	.....	۲۵
مطالعہ کا ڈھنگ	.....	۲۶
وسعت مطالعہ	.....	۲۸
مطالعہ کی بوقلمونیاں	.....	۳۰
ہمہ جہتی مطالعہ	.....	۳۱
خلوت پسندی	.....	۳۲
مطالعہ کی تنہائیاں	.....	۳۳
رفیقہ حیات شریک مطالعہ	.....	۳۳
علم ویقین کا واحد ذریعہ	.....	۳۴
علم خدا کی امانت ہے	.....	۳۵
انتخاب	.....	۳۵
موسمی ہوائیں گذر جائیں گی	.....	۳۶
مطالعہ کا اثر	.....	۳۶
تصویر یار	.....	۳۷

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے	.....	۳۸
تنوع اور وسعت مطالعہ	.....	۳۹
مولانا آزاد کا اسلوب تحریر	.....	۴۰
فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے	.....	۴۰
سلطان محبت	.....	۴۲
علم وسیلہ نہیں، مقصود ہے	.....	۴۳
ابوالکلام آزاد اور بلا کا حافظہ	.....	۴۴
جب سیاست راست نہ آئے	.....	۴۵
صرف دو رات مطالعہ سے باز رہا	.....	۴۵
محاسن کی تلاش	.....	۴۶
مخالفوں سے سلوک	.....	۴۶
دوستوں کا انتخاب	.....	۴۷
مخالفین کی تحسین	.....	۴۷
پابندی اوقات	.....	۴۷
زندگی سلگتے رہنے کا نام ہے	.....	۴۹
زبانوں کا ہذیان	.....	۵۰
مخالفین کا نہ جواب دیا نہ کتاب دیکھی	.....	۵۰
علم و یقین	.....	۵۱
کتابوں کا شوق	.....	۵۱
ناشتے کے پیسے کتابوں پر	.....	۵۷
مطالعہ اور حیلہ جوئی	.....	۵۸
حیات جاوید کے لئے بے تابی	.....	۵۹
ذوق کتب بینی اور بھائیوں میں رقابت	.....	۶۱
کتابوں پر نوٹ	.....	۶۳
ایک درد دل اور حسرت	.....	۶۳
افکار آزاد	.....	۶۵

دل ودماغ کا فاصلہ	.....	۶۵
لذت آشنائے درد	.....	۶۵
مسلمان	.....	۶۵
سیاست دان	.....	۶۶
چلنا سیکھنا ہوگا	.....	۶۶
جو کھوتے ہیں وہ پاتے ہیں	.....	۶۶
فقدان ہمت کا نام تقدیر	.....	۶۷
بڑی بولی کے منتظر	.....	۶۷
یک جان ودو قالب	.....	۶۷
ملت واحدہ	.....	۶۸
مسیحی عزائم اور استعماری مقاصد	.....	۶۸
اقوام یورپ سے خطاب	.....	۶۸
مقدس ہاتھ	.....	۶۹
برطانوی استعمار کی جماعت	.....	۶۹
تاریخ کے اوراق	.....	۷۰
قیامت سے پہلے قیامت	.....	۷۰
ایمان کی قوت	.....	۷۱
تمہارے قدموں کا انتظار	.....	۷۱
گوشہ امن وعافیت	.....	۷۲
میر کارواں	.....	۷۲
بے یار وآشنا اور غریب الوطن	.....	۷۳
جماعتوں کے اعمال	.....	۷۳
امتحان کی بازی گاہ میں	.....	۷۳
الہلال کی دعوت	.....	۷۴
میرا ورثہ	.....	۷۵
ہند کی فیاض گود	.....	۷۵

طاقت کے فیصلے	.....	۷۶
صبح آزادی	.....	۷۷
لیل ونہار کی گردشیں	.....	۷۸
دعوت عزم وہمت	.....	۷۹
تذبذب کار نہ چھوڑ دو	.....	۷۹
اشتعال اور بزدلی	.....	۸۰
تاریخ کا ساتھ دو	.....	۸۰
یہ ایمان کی جان کنی کیوں	.....	۸۱
لکھنے پڑھنے کی آزادی	.....	۸۲
زندگی کی سب سے بڑی آزمائش	.....	۸۲
سیاسی شورشیں اور علمی جمعیتیں	.....	۸۴
بوئے گل نالہ دل	.....	۸۶
استاد کی نگاہ اور دعا	.....	۸۷
افلاس کا عالم	.....	۸۸
دوستوں کا رنج	.....	۸۹
سفر اور قید دو پیمانے	.....	۸۹
محمد علی جناح اور علماء	.....	۹۰
مولانا مدنی قرون اولیٰ کی حیاء	.....	۹۰
اسلام کی طرف واپسی	.....	۹۱
جد وجہد میں / یونان کا نامور فلسفی	.....	۹۳
بوستان علم وعمل	.....	۹۶
امام مالکؒ موت کے دروازے پر	.....	۹۷
امام مالکؒ کا آخری کلام	.....	۹۹
امام مالکؒ اور تعظیم حدیث	.....	۱۰۰
درسگاہ مالکؒ کی عظمت وجلال	.....	۱۰۱
امام مالکؒ کا پسندیدہ شعر	.....	۱۰۲

بے مقصد سوالات کے حکیمانہ جوابات	.....	۱۰۳
عظمت صحابہؓ	.....	۱۰۳
تحصیل علم انہماک کامل	.....	۱۰۴
شوق حدیث	.....	۱۰۶
امام دار قطنیؒ کے لطائف وظرائف	.....	۱۰۷
امام شافعیؒ اور مسئلہ تقدیر	.....	۱۰۸
امام بیہقیؒ کے چند اشعار	.....	۱۰۹
علامہ حمیدیؒ کے چند اشعار	.....	۱۱۰
حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ عینیؒ، علمی ادبی لطیفہ	.....	۱۱۱
ایک ڈائری یا تجربوں کی تجوریاں	.....	۱۱۳
کتابوں کے مفت خورے	.....	۱۱۴
جوہر کی ایک نعتیہ غزل	.....	۱۱۶
ایک نالہ وفریاد	.....	۱۱۷
محمد علی جوہرؒ	.....	۱۱۹
تاریخ نگاری نہیں، تاریخ سازی	.....	۱۲۰
جوہرؒ کے جواہر	.....	۱۲۰
مولانا محمد علی جوہرؒ کی ایک غزل	.....	۱۲۱
دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد	.....	۱۲۲
محمد علی جوہرؒ، ذوق مطالعہ اور عشق رسولؐ	.....	۱۲۳
نور سحر	.....	۱۲۶
ٹوپیاں بن کر تحصیل علم کرتے رہے	.....	۱۲۶
ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہ دیتے	.....	۱۲۷
تصویر کشی کا شرعی حکم	.....	۱۲۷
تار کی خبر معتبر نہیں ! دلچسپ لطیفہ	.....	۱۲۹
مغرور مفتی ! تم اپنے ایمان کی خبر لو	.....	۱۳۰
فتویٰ کفر سے احتراز	.....	۱۳۲

قادیانیوں سے مناظرہ	.....	۱۳۳
جمال یوسف علیہ السلام	.....	۱۳۷
پاکدامنی وعفت	.....	۱۳۸
خدمت وصحبت استاد	.....	۱۳۸
استاد کی رفاقت، دیوبند چھوڑ دیا	.....	۱۳۸
فقر ودرویشی کی شادی	.....	۱۳۹
علم کا راز / طنطاویؒ سے تفہیم	.....	۱۴۰
کیڑوں کو ہٹاتے رہے	.....	۱۴۲
دوزخ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا	.....	۱۴۲
مدرسہ اور منتظمین / شیخ سے محبت	.....	۱۴۳
خالق پر اعتماد	.....	۱۴۴
نصائح کا نچوڑ	.....	۱۴۵
اخلاص، توکل اور استغناء	.....	۱۴۵
شاہ عبدالعزیزؒ	.....	۱۴۶
استاذ سے کمال محبت	.....	۱۴۷
علامہ انور شاہؒ اور مطالعہ	.....	۱۴۸
کمال حافظہ ومطالعہ	.....	۱۴۹
امام طحاویؒ اور حضرت بنوریؒ	.....	۱۵۰
عظیم شہادت / فنافی الشیخ	.....	۱۵۲
ذوق مطالعہ	.....	۱۵۳
بے انتہاء قربانی	.....	۱۵۴
اسمعت من ناجیت	.....	۱۵۵
ورنہ مدرسہ بند کردیں گے / اخلاص	.....	۱۵۶
نماز کا اہتمام / قصیدہ بردہ کا شعر	.....	۱۵۷
علامہ انور شاہ کشمیریؒ	.....	۱۵۷
حدیث موت وفراق	.....	۱۵۸

آغازِ گفتگو

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

زندگی، ابتلاء و آزمائش، کامیابی و ناکامی، فتح و شکست، عروج و زوال، انحطاط و کمال، پژمردگی و افسردگی اور مسرت و انبساط کی متضاد کیفیات سے مرکب ہے۔ راہ چلتا مسافر بھٹک جاتا ہے اور گمراہ راستے پر لگ جاتا ہے، قبض و ظلمت کی کیفیات سے بے دلی پیدا ہوتی ہے..... بسط و نور کی کیفیت سے عالی ہمتی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اللہ نے جب سے شعور بخشا تحصیل علم اور پھر خدمت علم کی نسبتوں کے حوالے سے مختلف میدانوں میں کام کی توفیق ارزانی فرمائی..... انفرادی اور اجتماعی کاموں میں انسانی اور فطری تقاضے اور ان کے لوازمات ابھر ابھر کر سامنے آتے رہے، بعض حالات میں کسل، سستی، انتشار، بے ہمتی، پژمردگی، قنوطیت اور فقدانِ شوق و محبت نے عظیم علمی اور دینی کاموں سے معطل کر کے رکھ دیا۔

بہار میں بھی گلستاں کا کیا کہوں احوال
ہیں اتنے کانٹے کہ دامن بچانا مشکل ہے

ایسے حالات میں اکابر اساتذہ، اہل اللہ اور علماء حق کی صحبتیں اور مجالس، عزم مصمم اور علوئے ہمت کا ذریعہ بنتی ہیں، مگر جب دل مرجائے اور عزائم پژمردہ ہو جائیں، تو قدم بھی نہیں اٹھتے اور صحبتِ صالح بھی میسر نہیں آتی، مگر مجھ گنہگار کے ساتھ رب کریم کا خصوصی فضل وکرم کا معاملہ رہا..... جب اکابر نہ ملے، علماء کی صحبت میسر نہ ہوئی ..... اہل اللہ تک رسائی نہ ہوسکی تب بھی تقدیر نے یاوری کی اور اپنی تحریری یادداشتوں پر مشتمل مسودات ''جگرِ لخت لخت'' تک پہنچادیا..... کاپی اٹھائی ابھی چند صفحے نہیں صرف چند اقوال ہی پڑھے کہ قبض کی کیفیات کافور ہوگئیں..... باطنی انقباض دور ہوگیا، بسط وسرور نے نئی ہمت، نئے عزائم، نئے حوصلے اور نئی زندگی عنایت فرمائی۔ کام میں دل لگنے لگا ..... مطالعہ، تحقیق تصنیف وتالیف، تحریر اور علمی کاموں کے بند دروازے کھلنے لگے، ایسا محسوس ہونے لگا گویا کسی نے عزم وہمت اور علمی وروحانی طاقت کا ٹیکہ لگادیا یا بھٹکے ہوئے مسافر کو گویا ''سراغِ زندگی'' مل گیا۔

احقر اپنے زمانہ طالب علمی میں اور پھر تدریسی، مطالعاتی، تصنیفی تالیفی اور تحریری..... الغرض مختلف مراحل میں اپنے اکابر وسلف صالحین کے علم پرور واقعات اور اقوال جو دل کو بھاتے، ہمت بڑھاتے نور ایمان کا باعث بنتے..... اپنی ذاتی ڈائریوں میں نقل کردیا کرتا۔

ہم نے اپنے آشیانے کیلئے
جو چھبے دل کو وہی تنکے لئے

احقر نے ایسی یادداشتوں پر مشتمل تحریروں کا نام ''جگرِ لخت لخت'' رکھا اور یہ نام اس شعر سے ماخوذ ہے۔

پھر جمع کر رہا ہوں جگر لخت لخت کو
مدت ہوئی دعوت مژگاں کیئے ہوئے

اور اب یہ ایک وسیع اور جامع علمی کشکول اور خزینہ معرفت بن گیا..... ترتیب و اشاعت کا کام ہو، تو کئی جلدیں بن جائیں گی، مگر ان میں سرفہرست امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اقوال ارشادات، تجربات اور ان کے علوم و معارف کا نچوڑ ہے، جو ان کی اور ان پر لکھی جانے والی مختلف کتابوں سے ماخوذ ہے۔ مولانا آزادؒ کی تحریروں کے علاوہ شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی، مولانا محمد علی جوہرؒ، ابوحنیفہ ہند مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے اقوال بھی اس میں منقول ہیں۔

جگر لخت لخت کے مجموعہ میں مجھے یہی باب سب سے زیادہ محبوب ہے، بار بار پڑھا..... ہر بار نور ایمان کا اضافہ ہوا۔ بے ہمتی، کسل اور فقدانِ شوق کی کیفیات میں جب ان اوراق پر نظر پڑی، ابھی چند سطریں ہی پڑھیں کہ کام کا حوصلہ ملا، بلکہ لائحہ عمل بھی متعین ہو گیا..... علمی و دینی اور تحریری کام کرنے والے احباب و مخلصین، اجتماعی دینی کام کرنے والے کارکنوں اور اساتذہ اور طلبہ علوم نبوت کے حضور اسے ایک گراں قدر اور وقیع تحفہ فکر و عمل کے طور پر پیش کر رہا ہوں..... نام اس کا ''سراغ زندگی'' رکھا جو اقبال مرحوم کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا ''سراغ زندگی''
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

قارئین پڑھیں گے..... مجھے یقین ہے، جیسا نام ہے ویسا؟

پائیں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پا ئیں گے۔ مجھے پڑھتے پڑھتے جن عزائم، کیفیات، حالات اور علمی و روحانی مراحل اور واقعات سے گزرنا پڑتا ہے..... خدا گواہ ہے، اس کی تعبیر کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے کتاب کا ایسا نام بھی نہ رکھا جاسکا جو مذکورہ تمام تر کیفیات کو جامع ہو..... اگر قارئین حوصلہ افزائی کریں گے، تو اس سلسلہ علم و معرفت کے دیگر مختلف ابواب بھی ''جگر لخت لخت'' سے انتخاب کر کے شائع کیئے جاتے رہیں گے۔

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دنیا میں کھینچ لاؤں، فضائے بہشت کو

عبدالقیوم حقانی

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ/۲ جولائی ۲۰۰۱ء

تحصیلِ علم وعبادت یا پیدائشِ دولت

اگر دمشق کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھی مجھ کو دوکان لگانے کا موقع ملے (جہاں بہ نسبت مسجد دہلی کی سیڑھیوں کی طرح دوکان خوب چلتی ہوگی) اور روزانہ پچاس دینار کی آمدنی ہو اور سب کی سب (اپنی ذات یا عیش پر نہیں) اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا کروں ..... ساتھ ہی کوئی نماز باجماعت بھی فوت نہ ہوئی ہو، نہ کسی ایسی چیز کو حرام جانتا ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، پھر بھی اس بات کو سخت ناپسند کروں گا ..... کہ ایسے لوگوں میں سے نہ بنوں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے:-

رجالٌ لا تلهيهم تجارةٌ ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوٰة و ايتاءِ الزكوٰة يخافون يوماً تتقلب فيها الابصار.

(وہ مرد کہ نہیں غافل ہوئے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں ..... اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں)

اور ظاہر ہے کہ عبادت علم دین پر موقوف ہے اور علم، وہی علم ہے جو مخلوق کو خالق سے جوڑے جو وحی الٰہی سے مستیز ہو..... اس لئے تو علم دین کا ایک مسئلہ جان لینا ایک ہزار رکعت نماز نفل مقبول سے افضل ہے..... ایسے لوگ جن کو فکر معاش یا پیدائش دولت کے مشاغل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتے۔

یہ بیان حدیث کے مشہور راوی حضرت ابودرداء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور اسلام سے زمانی و مکانی، علمی و عملی ہر طرح کا سب سے بڑھ کر قرب رکھنے والے حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر یہ سمجھنے سمجھانے کا حق کس کو حاصل ہے..... کہ انسان فکر معاش یا پیدائش دولت کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے پیدا کرنے والے کی یاد و عبدیت کے لئے پیدا کیا گیا ہے (وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منهم من رزق وما ارید ان یطعمون) (اور میں نے جو بنائے جن و انس (آدمی) سو اپنی بندگی کو میں نہیں چاہتا ان سے روزی اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔

(تجدید معاشیات ص ۷..... از مولانا عبدالباری ندوی)

نو واردانِ علم و عرفان کی خدمت میں

ایک تحریر جس نے مجھے زندگی کا شعور بخشا اور اسے برتنے کا سلیقہ بھی سکھایا جس کے مطالعے کا مجھے ۱۹۸۷ء میں موقع ملا، پہلی ہی نظر نے طبیعت پر ایسا رنگ چڑھایا کہ پھر کوئی دوسرا رنگ نہ چڑھ سکا۔

روح پدرم شاد کہ فرمود بہ استاد
پسر مرا عشق بیاموز، دگر ہیچ

مطالعہ ایک خط کا تھا، مختصر تحریر کا تھا مگر اس نے میری زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ دل و دماغ کی ایسی کایا پلٹ دی کہ آج تک اسی مکتوب، اس کے کاتب کا نام اور تحریر میں بتائے ہوئے کام سے محظوظ اور اسی دھن میں لگا ہوا ہوں۔ اس مختصر تحریر سے جو کچھ نصیب ہوا اس کو نعمت غیر مترقبہ جان کر دل نے بہ صد عزت و احترام محفوظ کر لیا، اب یہ سنگ میل اور مبارک نشان راہ روح و قلب پر نقش ہیں باعث تسکین دل و جان ہیں جب کبھی تساہل، غفلت، کسل، ہجوم وافکار نے آ گھیرا نشان راہ دھندلا گئے تو گردن جھکا کر لوح دل کے نقش کو دیکھا، تو یہی تحریر اور ولولہ تازہ ملا۔

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکالی دیکھ لی

یہ مختصر تحریر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ہے یہ خیالات و افکار مولانا ابوالکلام آزادؒ نے پیدا کیے، یہ گناہ گار انہی کے ان افکار و خیالات کے بقاو قیام کیلئے اشخاص کی تلاش میں ہے۔ یہ بھی تو ابوالکلام آزادؒ ہی کا ارشاد ہے کہ ''علم و بصیرت اگر چاہتے ہو تو یہ علو و ترفع کیوں ؟ روشنی کے طالب ہو تو جہان سے ملے لے لو، یہ نہ دیکھو کہ چراغ شمع کافوری ہے یا مٹی کا دیا؟ میں یہ تحریر علماء، اکابر، مشائخ، محققین مصنفین اور ارباب فضل کی خدمت میں نہیں، اپنے نوخیز طلباء اور راہ نوردانِ علم و عرفان کی خدمت میں ایک تحفہ فکر و عمل کے طور پر نذر کر رہا ہوں۔

شاید کہ آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مولانا آزادؒ کی یہ مختصر تحریر فکر انگیز، بصیرت افروز اور ایمان پرور ہے۔ معلومات کا خزینہ اور افاداث کا گنجینہ ہے، جو انہوں نے اپنے دوست کے نام بصورت خط تحریر فرمایا، ذیل میں نذر قارئین ہے۔

(عبدالقیوم حقانی)

کامیاب زندگی، مستقل نظام عمل

برادرم! السلام علیکم ..... سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہئے کہ آپ کی نسبت یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا، زندگی کی کامیابی کیلئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کرلیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و واقعات کے حوالے نہ کر دیا جائے، بہت سے لوگ باوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی سے کوئی بڑا کام مدۃ العمر نہ لے سکے، صرف اسی لئے کہ کوئی مستقل نظام عمل ان کے سامنے نہ

تھا؟

آپ کے لئے جس قدر میں نے غور کیا اخبار نویسی کی زندگی موزون نہیں بلکہ ہلاکت وقت اور ضیاع قوت ہے، اخبارات بلاشبہ دعوت وتذکیر کا ایک بڑا ذریعہ ہیں لیکن جب تک ایک نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی شکل میں ان سے کام نہ لیا جائے اور نہایت وسیع پیمانے پر اسباب و وسائل مہیا نہ ہوں، مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتے اور محنت یکسر رائگاں جاتی ہے۔ اوّل تو ایسا اہتمام چند در چند وجوہ سے مستبعد۔

ثانیاً..... بصورت حصول اس درجہ مشکلات وعوائق حائل کہ ان پر عبور و غلبہ شخص واحد سے ممکن نہیں جب تک جماعت نہ ہو، علاوہ بریں اس شغل میں رہ کر صرف سیاسیات کیلئے وقف ہونا پڑتا ہے اور علمی ذوق کو مدۃ العمر کے لئے ترک کر دینا پڑتا ہے۔

آپ کیلئے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل وطرز کی، جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے، علماء اسلام کے حالات پڑھیئے، درس وتدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی میں تین عظیم الشان خدمات انجام دیتے تھے۔ عوام کی اصلاح، وعظ وتذکیر سے، مستقبل کیلئے تیاری درس وتدریس سے اور علم ومذہب کی خدمت دائمی تصنیف وتالیف سے۔ ابن جوزیؒ مصنف ہیں۔ مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالیؒ مدرسہ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ، علماء اسلام کی زندگی کیلئے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہوگئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا

ہو، صبح کو درس دیا، بقیہ اوقات میں تصنیف وتالیف اور جامع و جوامع میں وعظ وتذکیر کا سلسلہ جاری۔ جب یہ چیز مفقود ہوگئی اور ان تینوں اجزاء کو الگ الگ کر دیا گیا، واعظوں کا طبقہ الگ مصنفین کا الگ اس وقت سے سلسلہ ہدایت حقیقی ونشو ونما علم مفقود و معدوم ہوگیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کیلئے تیار ہو جائیں، آپ کے لئے بہترین موقع حاصل ہے.....

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا یہ پورا خط ہی نہایت قیمتی افادات پر مشتمل ہے اس کے ایک ایک پیراگراف کیا بلکہ ایک ایک جملے میں جو معانی و مفاہیم سمو دیے گئے ہیں، ان پر تبصرے اور ان کے خصائص کی طرف اشاروں کیلئے بھی دفتر کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام کا ذوق سلیم ان سے نا آشنا نہیں رہ سکتا، اس سے زیادہ تفصیل وتبصرہ تحصیل حاصل کا مصداق ہے۔

زندگی کی کامیابی کیلئے مولانا آزادؒ کے تحریر فرمودہ اصول آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، یہ زندگی کی کامیابی حاصل کرنے کا سنہری اصول ہے اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے بارے میں کوئی مستقل پروگرام نہیں رکھتا اور اس کیلئے کسی نظام پر کاربند نہیں، تو یقین رکھنا چاہیئے کہ اسے زندگی کی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

(ماہنامہ القاسم/ ج ۴ ش ۱۲/ اپریل ۲۰۰۱ء)

نفس و جذبات کی آزمائش

اس عنوان کے تحت ذیل میں امام الہند ابوالکلام آزادؒ کا ایک علمی تاریخی اور نتائج و ثمرات و اثرات اور حقائق کے لحاظ سے انقلابی تحریر درج کی جارہی ہے جو انہوں نے اپنے ایک مخلص کے نام لکھی تھی جن کے پیش نظر علمی اور تحقیقی کام تھے، جن کو علمی کاموں کے معالی امور اور مشن کے لحاظ سے اعلیٰ ترین اہداف پر کام کرنا تھا مگر اس کارگاہ خطا و نسیان میں وہ بے چارے بھی کہیں پھسل گئے۔ مرغوباتِ نفس نے گھیر لیا اور نفس و جذبات کی آزمائش مسلط ہوگئی۔ مولانا آزادؒ نے جس قدر میٹھے، پیارے، فکر و عقل اور دل و دماغ کو اپیل کرنے والے ناصحانہ اور مخلصانہ انداز سے انہیں اس ابتلاء سے مخلص اور امتحان میں کامیاب ہونے کی راہ بتلائی وہ ان ہی کی خصوصیت و امتیاز ہے۔ میں نے بار بار پڑھا، ہر بار قند مکرر کا لطف حاصل کیا، قارئین پڑھیں تو یقیناً محظوظ ہوں گے اور عملی زندگی میں اپنے لئے سنگ راہ اور نشان منزل پائیں گے۔ (عبدالقیوم حقانی)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ایک ایمان افروز مکتوب

[۱۹۱۲ء] عزیزی السلام علیکم!

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے' تخصیص و تعین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجبِ صلاح و فلاح فرماوے۔ یقین کیجئے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوائل و فضائل کیلئے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں' سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوت ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ مع المحسنین ۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملے کو نہیں بھولوں گا اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجئے۔ اپنے اندر عزم پیدا کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے مددگاری طلب کیجئے۔ زندگی چند روزہ ہے' اور سارے مطلوبات نفس وہم وخیال سے زیادہ نہیں۔ کب تک اس بند وقید میں گرفتاری رہے گی؟ جو دل فاطر السمٰوٰت والارض کے عشق کا متحمل ہوسکتا ہے' اس کو فانی و وہمی الفتوں میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے۔ طلب مفرط جس چیز کی بھی ہے انداد وطواغیت میں داخل ہے ..... فلا تجعلوا للہ اندادا وّ انتم تعلمون اور یُحبونھم کحب اللہ ط والذین امنوا اشد حُباً للہ ..... محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ احب چیز کو اس کیلئے چھوڑ دینا چاہیے ..... حتیٰ تنفقوا مما تحبون

پس اصلی وحقیقی اور ایمانی واحسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگایئے۔ الَا بِذِكرِ الله تَطمَئِنُّ القُلُوب ۔ اور ایک مرتبہ پوری قوت وعزم کے ساتھ ...... اِنِّي وَجَّهتُ وَجهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ حَنِيفاً اور لَا اُحِبُّ الاٰفِلِينَ ۔کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے' اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی' اور انشاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عنداللہ۔

غور کیجئے ! آپ متاہل ہیں' مجرد نہیں ۔ پھر صاحبِ اولاد اور حقوق اہل وعیال کی کشاکش سے درماندہ' کوئی ضرورت شرعی واخلاقی ازدواج ثانی کیلئے باعث نہیں ۔ پھر ایک طرف افلاس وقلۃ معیشت کی بے سروسامانی' دوسری طرف عوازم و معالی امور وعمل کا ولولہ ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا ؟ بلاشبہ ابتداء میں مسرتِ حصولِ مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا' لیکن بہت تھوڑی دیر کیلئے ۔اس کے بعد قدرتی کشاکش اور مشکلات وصعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے' عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہوجائے۔

یہ کشمکش زندگی کیلئے سب سے بڑی مصیبت ہے ۔ابھی ایک لمحے کیلئے اس کا احساس نہیں ہوسکتا ۔ یہ عام قاعدہ ہے' لیکن جب یہ حالت پیش آجائے گی تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا ۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے' جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہورہا ہے ۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر ۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا

جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کیلئے مہیا نہ کرسکیں گے' پھر اپنی بیوی کا خیال کیجئے ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں ۔ کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اس کی تمام بقیہ زندگی تلخ کردی جائے؟

میری شادی کو دس سال ہوگئے ۔ یقین کیجیے کہ میرے لئے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا ۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لئے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا ۔ پھر دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا' تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا ۔ صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کرسکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان ۔

آپ کہیں گے دل کسی کے بس میں نہیں؟ ہاں! لیکن جو چاہے اُس کے بس میں ہے ۔ دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے اُس کو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے ۔ وہ دل کی لگام جس طرف چاہے موڑ دے گی ۔

اس بارے میں کثرت سے عواقب و نتائج پر غور و تفکر' مطلوبِ نفس کی ہیچ مائیگی اور بے حاصلی کا تصور' کثرتِ استغفار و دعا' اور مشغولاتِ دینیہ انشاء اللہ نہایت سود مند ہوں گے ۔ اگر ایک دعاء بھی پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ نکل گئی، تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا،

صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ جائے کہ طلب وعشق اور اضطرابِ قلب واشکِ چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی وخیالی مطلوب کے لئے کس طرح ضائع جارہی ہیں' اور اگر یہ سب کچھ اللہ کیلئے ہوجائے تو پھر یہی وجودِ فانی کیا کیا کچھ نہیں کرسکتا' اور آزمائش سے نکل جانے میں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

(۲) لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے' تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ کر فوراً بھاگل پور چلے جایئے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔ اور جس قدر مشکلات ومہالک پیش آئیں گے' ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجے موجودہ اضطرابِ نفس سے بہتر ہوگی۔ اقلاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہوجائیں گے۔ غرضے کہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے' یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہوگی۔ والعاقبۃ للمتقین۔ (مولانا ابوالکلام آزاد.....از پروفیسر محمود واجد ہاشمی ص ۴۶)

ذوقِ علم اور شوقِ مطالعہ

علم کی حقیقت

مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

''بہر حال علم یہ نہیں کہ دوسروں کے عیب تلاش کئے جائیں نہ ملیں تو وضع کر لئے جائیں، پھر ان میں طعن وطنز کے آب وگل سے چمک پیدا کی جائے اور غیبت سے رسم وراہ رکھی جائے۔ علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو مجلّٰی کرتا اور فرش سے اٹھا کر عرش پہ لے جاتا ہے''۔

(مولانا ابوالکلام آزادؒ صفحہ نمبر ۳۳..... از شورش کاشمیری)

علم وعمل، حسب ونسب

مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں

''میں نے تذکرہ ہی میں لکھا تھا کہ میں حسب ونسب کا استخوان فروش نہیں۔ میں نے نسب فروشی کی دکان لگانے سے ہمیشہ احتراز کیا، اور کبھی اس طرح ''نقد عزت وشرف،، کی جستجو نہیں کی۔ اسلام

کے نزدیک ایک انسان کا حسب ونسب اس کا علم وعمل ہے۔ خاندان پر فخر وناز کا بت دنیا کے عہد جاہلیہ کی ایک یادگار مشئوم ہے اسلام نے اور بتوں کے ساتھ اس بت کو بھی توڑ دیا تھا بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کا حسب ونسب اسلام تھا اور سلمان فارسی ابن اسلام کہلاتے تھے۔ (مولانا ابوالکلام آزادؒ ص ۳۵ از شورش کاشمیری)

شورش کاشمیری لکھتے ہیں

''احقر سے اجمل خان سیکرٹری ابوالکلام آزادؒ کے تعلقات دوستانہ ہی نہیں برادرانہ تھے۔ ایک دفعہ راقم سے اس سوال پر کہ مولانا ذات پات کی اعتبار سے کیا تھے؟ راقم سے کہنے لگے مولانا کا حسب ونسب ان کا علم وارشاد ہے''۔ (ایضاً ص ۴۰)

عربوں میں قبائل کی تقسیم تھی وہ کوئی شرف نہ تھا، اسلام نے اسے ختم کر دیا کہ یہ چیز ایک دوسرے کی پہچان کیلئے ہے، اور کوئی شرف ہے تو وہ علم ہے، عمل ہے، تقویٰ ہے۔ بعض خاندانوں کی ذوات صوتی اعتبار سے اتنی مضحک ہیں کہ ہنسی آتی ہے، سوال ہے کہ ان میں شرف کیا ہے؟ نسل انسانی آدم وحوا سے چلی ہے، ہم سب ان کی اولاد ہیں اور شرف میں ساری کی ساری نسل انسانی شامل ہے، حقیقی شرف کوئی شرف شے ہے تو اسلام ہے اور اسلام میں علم، تقویٰ اور عمل اس شرف کے عناصر ترکیبی ہیں۔ (ایضاً ص ۴۱)

فقہ بغیر علم کے

''ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا

''علم استدلال پیدا کرتا اور فراست کو جلا دیتا ہے، مگر فقر و

استغنا سے وجدان کو بال و پر ملتے اور زندگی پر رونق ہوتی ہے۔ لیکن محض فقر و استغنا، بغیر علم و نظر ایک ایسا درخت ہے جس میں پھول اور پھل نہیں لگتے۔ امام مالکؒ فرماتے تھے ''جو شخص صوفی ہوا اور فقیہہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا''۔ (ایضاً ص ۵۲)

مطالعہ کا ڈھنگ

مولانا آزادؒ بیان فرماتے ہیں

''یسر و عسر جو حالت بھی رہی میں نے کتابوں کی خریداری سے کبھی بخل نہیں کیا۔ میرا واحد شوق کتابوں کا حصول تھا اور اس کے وجوہ تھے۔ میں نے کتابوں کی فضا میں آنکھ کھولی۔ ابھی لڑکپن کے حدود میں داخل نہ ہوا تھا کہ مطالعے کی چاٹ لگ چکی تھی۔ اپنی استعداد سے بڑھی ہوئی کتابیں پڑھتا۔ ہمارا گھر حافظہ کی ایک عظیم کان اور کتابوں کا نگر تھا۔ والد کتابوں کے شیدائی تھے، بڑے بھائی نوجوان عمر میں رحلت کر گئے، لیکن ان کی غذا بھی کتابیں ہی تھیں۔ بہنوں کے لئے کتابیں زیور تھیں، میں کتابوں کے معاملے میں اس طرح تھا گویا میرا خمیر ہی ان سے اٹھا ہے، مجھے کتاب کے بغیر اپنا وجود ادھورا محسوس ہوتا۔ والد مرحوم کا شوق کتابوں کا حصول اور ان کا مطالعہ تھا اور اس کی انتہا یہ تھی کہ دنیا کے مرغوبات میں کوئی چیز انہیں اس درجہ مضطرب نہ کرتی جتنا وہ ایک کتاب کیلئے مضطرب ہوتے تھے وہ عاریت کے بجائے ذاتی کتاب سے خوش ہوتے اور

ان کا سب سے بڑا مصرف کتابوں کی خریداری تھا۔ حجاز، عراق مصر، شام اور قسطنطیہ کے تمام بڑے کتب خانے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ وہ کتابوں کے عشق ہی میں سال سال دو دو سال اُن ملکوں میں رہتے تھے۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ غیر ملکی لائبریریوں سے دوسو کتابوں کی نقلیں لائے تھے اس کے علاوہ ہر سفر میں کتابوں کے دس پندرہ صندوق ہوتے۔ اس وقت مختلف عرب ملکوں میں جتنی شہرہ آفاق کتابیں موجود تھیں انہیں نقل کروالیا تھا۔ میں نے ان سب کو اپنے حافظہ میں اتار لیا، لیکن ان کی وفات کے بعد صدمہ ٹھہر گیا اور دیکھا تو کتابوں کے صندوق خالی تھے معلوم نہ ہوسکا کتابیں کہاں گئیں اور کون لے گیا ہم نے فرض کرلیا کہ تلف ہوگئیں ہیں۔

میرا حال یہ تھا کہ دس برس کی عمر میں ناشتے کے جو پیسے ملتے ان کو جمع کرتا اور ان سے کتابیں خریدتا تھا۔ اس وقت اردو پڑھنا اگر چہ ایک تعلیمی بدچلنی خیال کی جاتی تھی لیکن میں اردو کی طرف بگٹٹ جارہا تھا۔ دن کو درسی مطالعہ کرتا رات کو ایک دو بجے تک خرید کی ہوئی کتابیں پڑھتا۔ میرا مطالعہ جوانی سے بہت پہلے جوان ہوگیا تھا میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہر مطبوعہ ورق پڑھ ڈالتا۔ سرسید کی کتابوں کا شوق بے پناہ ہوگیا تو سب کتابیں خرید کیں اور پڑھ ڈالیں۔ حال یہ تھا کہ ہر مضمون کی کتاب شریک مطالعہ تھی۔ میں کتاب پڑھتا نہیں ہضم کرتا تھا، عربی پڑھی تو اس کا سارا ذخیرا ہضم کرلیا۔ فارسی پڑھی تو اس میں ڈوب گیا۔ اب اردو کی راہ کھلی تو

ایسی چینک لگی کہ اسی کا ہوگیا۔ سب کچھ پڑھ ڈالا۔ مولانا حالی مولانا محمد حسین آزادؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا شرر اور مولوی نذیر احمد کے قلم سے جو نکلا میں ان سے کما حقہ، آشنا ہوتا رہا۔ اس مطالعہ ہی نے مجھے علوم جدیدہ کا شوق ڈالا اور میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے کتابیں پڑھتا رہا۔ میں نے ابتداء میں اخبارات کی ایڈیٹری اس لئے قبول کی کہ ان کی وساطت سے عربی کے رسائل آتے تھے۔ میں نے بعض کتب خانے خرید کئے اور والد کے مریدوں نے اس زمانے میں میرے شوق کا ساتھ دیا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں، پھر ایک خاصا کتب خانہ جمع ہوگیا، میں نے بعض رسائل میں اُجرت پر مضامین لکھ کر خرید کیا۔ میرے مطالعہ کا ایک ڈھنگ یہ بھی تھا کہ میں کتابوں پر نوٹ لکھتا، پھر ان سے میرے غور وفکر کو پرواز ملتی اور میں آسانی کے ساتھ دماغی سفر کرسکتا تھا۔ میرا مطالعہ صرف کتابوں تک محدود نہ تھا میں نے وقت کی علمی ہستیوں سے جن کا وجود ایک ادارہ وتحریک تھا کما حقہ، استفادہ کیا، مثلاً مولانا شبلیؒ ایک ادارہ و تحریک تھے اور ان کا کتب خانہ بھی بجائے خود منفرد و یگانہ تھا اور اس زمانے میں اس سے محروم رہنا بدقسمتی تھا۔ (ایضاً ص ۷۰)

وسعت مطالعہ

مولانا آزادؒ تحریر فرماتے ہیں

''الہلال'' نکالا تو قدامت کا ذخیرہ کتب بکمال وتمام دیکھ چکا تھا اور ساتھ ساتھ زبان وعلم کی جدید کروٹوں سے آگاہ ہو رہا تھا۔

میں نے ہندوستان کا سارا لٹریچر پڑھ لیا تھا۔ عربی، فارسی، اور اردو میں مذہب، تاریخ، فلسفہ، الٰہیات شاعری، منطق، طب، علم الہیئت، غرض کہ ہر فن پر جتنی نافع و جامع کتابیں تھیں وہ سب میرے مطالعے میں آ چکی تھیں۔ اب میں خود ایک کتب خانہ تھا۔ میں نے مطالعے کی منزلیں اس طرح طے کی تھیں کہ علم کو پہلے خاموشی سے دیکھا، پھر توجہ سے سنا، پھر حفظ کیا، پھر اس کی اشاعت کی اور یہ قول فضل بن عیاض کا ہے کہ ''میرا سارا اثاثہ وہ کتابیں ہیں جو میں نے نصف صدی میں جمع کی ہیں''۔ جب تک میں انگریزی اور فرانسیسی سے نابلد تھا، میرے مطالعے میں عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں تھیں لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد سے صرف انگریزی اور فرانسیسی ہی دیکھتا ہوں۔ ان کے علم کا لحظہ بہ لحظہ تغیر کسی دوسری زبان کے ادب کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ ہماری زبانوں کے مصنف اپنے قاریوں سے انصاف نہیں کرتے وہ انہیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں لیکن انگریزی اور فرانسیسی زبان کے اہل قلم اپنی اختیاری اور تاریخی غلطیوں کے باوجود قارئین کو معلومات دیتے اور ایشائی زبانوں کی طرح دماغوں کا شکار نہیں کرتے، ہر اچھی چیز مطالعے کی ہے۔ الٰہیات، مذہبیات، عمرانیات، تاریخ، فلسفہ ادبیات اور جدید سائنسی علوم سے متعلق جو کتاب بھی یورپ میں چھپتی ہیں انتظام کر رکھا ہے کہ ناشر اس کی پہلی کاپی مجھے بھیج دیتے ہیں اور میں اس کے مطالعے سے جلد فارغ ہو جاتا ہوں ایشیاء یورپ کے مادی غلبے سے بسرعت نکل جائے گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس کے ذہنی

غلبہ سے کیونکر نکلا جائے اور وہ کونسی شکل ہے کہ ہم اس کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکیں۔ (ایضاً ص ۷۲)

مطالعہ کی بوقلمونیاں

مولانا اسداللہ خان میرٹھی رقمطراز ہیں

''مولانا آزادؒ کے مطالعہ کی بوقلمونیوں کے پھیلاؤ کا حال یہ تھا کہ انقلاب فرانس سے متعلق کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب اس طرح دیا گویا خود انقلاب فرانس کے بانی ہیں۔ ایک صاحب نے پتنگ بازی کی تاریخ پوچھی تو اس طرح تفصیلات بیان کیں کہ ہر شخص مبہوت ہو گیا۔ ایک ہندو نوجوان کشن چندر ایم اے ہمارے ساتھ قید خانے میں فلاسفر کے نام سے موسوم تھا، اس نے مولانا کو صرف مولوی سمجھا اور ان کے علم سے متعلق متذبذب تھا۔ ایک دن میرٹھ کالج سے یورپی فلسفے کی تازہ ترین کتاب منگوائی اور دو چار ساتھیوں کے ساتھ صلاح کر کے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سے کہا کہ فلسفے پر لندن سے تازہ کتاب آئی ہے۔ لیکن اس کے مندرجات اتنے دقیق اور پیچیدہ ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہے۔ براہ کرم ان کے سمجھنے میں مدد فرمائیں۔ مولانا نے کہا کہ میرے پاس چھوڑ دو میں اسے کل کسی وقت دیکھ کر بتاؤں گا کہ اس میں کیا لکھا ہے..... اگلے روز دونوں مولانا کے پاس گئے، مولانا نے دریافت کیا تمہاری سمجھ میں کیا چیز نہیں آئی؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو اس میں سے کچھ نہیں سمجھے۔ مولانا نے پہلے اس کے ابتدائی مطالب بیان

کئے، پھر ساری کتاب کی حقیقت بتادی اور ساتھ ہی ساتھ نشاندہی کردی کہ مصنف نے فلاں فلاں جگہ ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ نوجوان جو فلسفے میں کسی کو پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا تھا، دنگ رہ گیا۔ ہر کسی سے کہتا تھا کہ مولانا کا دماغ قدرت کا معجزہ ہے''۔ (ایضاً ص ۷۳)

ہمہ جہتی مطالعہ

نیاز فتح پوری نے ان کی عظمت ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے، وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر محض دینی و مذہبی فلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہؒ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کیلئے اپنی آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رُشد اور ابن طفیل سے کم درجہ کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالیؒ اور رازیؒ سے کم نہ ہوتے اور اگر مسلک اعتدال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے،،۔

اسی مضمون میں نیاز لکھتے ہیں کہ

''ایک بار حکماء اسلام کے سلسلے میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولاناؒ نے اس کی مشہور کتاب حیی بن یقطان کی پوری داستان ایک

نشست میں اس طرح سنادی گویا وہ اس کے حافظ تھے اور یہ سب مطالعہ کے کرامات تھے۔ فرمایا!

''اس وقت میری عمر ۶۸ برس ہے، آٹھ سال نکال دیں ساٹھ سال کے دن شمار کریں، تو ۲۱۹۰۰ ہوئے ہیں۔ اب اس میں قید و بند کی دن بھی ہیں، علالت کا زمانہ بھی اور اِدھر اُدھر کی مشغولیتوں کے ایام بھی، اب میرا خیال ہے کہ میں نے عمر کے اس موڑ تک پندرہ ہزار کتابیں ضرور دیکھی اور پڑھی ہیں اور بہت کم کتابیں اس قابل ہوتی ہیں کہ انہیں الف تا ی پڑھا جائے، اکثر کتابیں اپنے چند صفحات ہی میں جاسوسی کر دیتی ہیں کہ ان میں کیا ہے؟ (ایضاً ص ۷۳)

خلوت پسندی

مولانا آزادؒ فرماتے ہیں

☆ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں۔ میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔

☆ ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔

☆ لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش ہوتی کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔

☆ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے۔

☆ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔

☆ جب کبھی قید خانہ میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کیلئے سزا کیسے ہوسکتی ہے؟ اگر دنیا اس کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کیلئے حاصل کی جاسکیں۔ (ایضاً ص ۴۷)

مطالعہ کی تنہائیاں

مولانا آزادؒ نے فرمایا:

''میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا ہے۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کو سرگزشت اور ملکوں کو تاریخ کا بالواسطہ علم بخشتا ہے، جس طرح سائنس کے معلموں میں حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقتوں کا علم ہوتا اور مختلف اقوام کے امزجہ وطبائع کا پتہ چلتا ہے''۔ (ایضاً ص ۸۱)

رفیقہ حیات شریکِ مطالعہ

جن دنوں مولانا تفسیر لکھ رہے تھے! معمول یہ تھا کہ دو بجے رات کو اُٹھ بیٹھتے، لکھنا شروع کرتے۔ موسم گرما ہوتا تو زلیخا پنکھا جھلتی کئی دفعہ رتجگا سے نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے پیدا ہوتے۔ ایک دفعہ حمیدہ سلطان کی والدہ نے پوچھا، بھاوج آنکھیں گلابی ہورہی ہیں، جواب دیا، رات

بھر مولانا کو پنکھا جھلتی رہی ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں، تفسیر لکھیں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔

مولانا کے دل میں زلیخا بیگم کے لئے بے انتہا محبت اور بے پناہ احترام تھا۔ ایک عقیدت مند کی شادی پر اپنے خط ۵ جنوری ۱۹۴۲ء میں لکھتے ہیں کہ ازدواجی زندگی تین چیزیں پیدا کرتی ہے: سکون، مودّت رحمت، سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

''مودّت'' سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے اور محبت کا یہ رشتہ اس وقت تک پائیدار رہتا ہے، جب تک رحمت کا سورج شوہر اور بیوی کے دلوں پر چمکتا رہے یعنی شوہر اور بیوی اس طرح محبت کریں کہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دینے اور باہمدگر کوتاہیاں نظر انداز کر دینے کیلئے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ گویا ازدواجی زندگی میں رحمت خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دینے کا نام ہے۔ آزاد اور زلیخا اسی سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ تمام زندگی ایک مصفا تصویر کی طرح بسر کی اور آخرت کے سفر کو روانہ ہو گئے۔ (مولانا آزادؒ ص ۱۰۵ از شورش کاشمیری)

علم و یقین کا واحد ذریعہ

''دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت ہیں اس کے سوا علم و یقین کا اس سماء دنیا کے نیچے وجود نہیں اس کے ماسوٰی جو کچھ اور جس قدر بھی ہے، قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ ظن ہے، تخمین ہے، قیاس

ہے، اٹکل ہے تخریص ہے اور تلعب بالریب ہے، ظلمت ہے، ظلمات ببعضھا فوق بعض ہے''۔

علم خدا کی امانت ہے

''علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لئے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے اس حکومت نے علم کو علم کیلئے نہیں معیشت کیلئے ذریعہ بنایا ہے،،۔ قرآن کی حقیقت سے آشنا ہونے کیلئے بیضاوی و بغوی کی ورق گردانی نہیں بلکہ دل دردمند کے الہام اور جبرئیل عشق کے فیضان کی ضرورت ہے''۔ (ایضاً ص ۱۴۵، ۳۱۰)

انتخاب

ہفت روزہ چٹان کے مدیر شہیر لکھتے ہیں!

''میرا خیال ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ سے میری عقیدت کا رشتہ استوار ہے اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے رہنماؤں میں سب سے زیادہ محبت انہی سے کی ہے۔ قید خانے میں مجھ سے یوسف مہر علی نے پوچھا تھا اگر تمہیں رہنماؤں میں سے ایک رہنما منتخب کرنے کیلئے کہا جائے اور کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب، تو تم کس کا انتخاب کروگے؟ میں نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر جواباً کہا تھا، رہنماؤں میں ''ابوالکلام آزاد،، اور کتابوں میں ''ترجمان القرآن،، میری زندگی ان دونوں سے متاثر ہے اور میں نے قلم و زبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ انہی کی بدولت ہے''۔

(ہندوستان میں ابن تیمیہؒ ص ۱۷..... از شورش کاشمیری)

موسمی ہوائیں گزر جائیں گی

شورش کاشمیری رقمطراز ہیں:

''ابھی چند روز کی بات ہے۔ میں اور بخشی غلام محمد صاحب آپ سے دہلی میں ملے تو کسی عنوان سے قوم پرور مسلمانوں کے بارے میں لیگ کے فسادی رویے کا بھی ذکر آ گیا۔ بخشی جی نے کہا ان کا اصلی علاج پٹائی ہے۔ فرمایا۔ ''میرے بھائی یہ بات تو حلق سے نیچے نہیں اترتی،،۔

چراغ حسن حسرت نے بھی اسی قسم کا ایک واقعہ نہرو رپورٹ کے زمانے کا لکھا ہے۔ کلکتہ میں مولانا شوکت علی مرحوم نے مخالفانہ مظاہروں کا باقاعدہ اہتمام کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ جن میں بہت سے راہنما بھی تھے آئے اور جوابی کاروائی کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن آپ نے روکا اور فرمایا! ''میرے بھائی موسمی ہوائیں ہیں، گزر جائیں گے،،۔ (ایضاً ص ۵۰)

مطالعہ کا اثر:

معروف سکالر جناب ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی تحریر فرماتے ہیں

''سال ۱۹۱۲ء کا تھا کہ میں مڈل سکول ہری پور (ہزارہ۔ صوبہ سرحد) میں داخل ہوا۔ والد محترم ''الہلال'' کا پہلا پرچہ میرے مطالعہ کیلئے لائے مجھے پڑھ کر سنایا۔ بعد میں ہر پرچہ مجھے بھیجتے رہے اور تاکید فرماتے رہتے کہ ''الہلال'' کا مطالعہ کرتے رہو۔ یہی استدعا انہوں نے میرے استادوں سے بھی کی۔

روح پدرم شاد، گر فرمود بہ استاد
پسر مرا عشق بیاموز، دگر ہیچ

اس مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ بچپن میں جو رنگ طبعیت نے اختیار کرلیا تھا پھر اس پر کوئی دوسرا رنگ نہ چڑھ سکا۔

''الہلال'' کے مطالعہ نے میری زندگی کے دھارے کا رخ ایسا بدلا اور میرے دل و دماغ کی ایسی کایا پلٹ کی کہ آج تک ان کے نام اور کام سے مسحور ہوں ان سے وابستگی اتنی بڑھی کہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی اور ان کے فضائل و محاسن اور افکار و خدمات میں لکھی گئی ہر تحریر کو حاصل کرنے کیلئے ہمیشہ بے چین رہا اور روح و دل کی آسودگی کا سامان پیدا کرتا رہا۔

(''مولانا ابوالکلام آزاد'' از ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی ص ۱۶)

تصویر یار

جناب ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی تحریر فرماتے ہیں

''ان (مولانا آزادؒ) کی دید کا شرف ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوا جلسوں میں ان کو دور سے بہت دفعہ دیکھا۔ ان کی تقریر کو سنا، لیکن نزدیک سے دیکھنے کے مواقع کم اور پھر ان سے بالمشافہ گفتگو کے مواقع اس سے بھی کم نصیب ہوئے لیکن جو کچھ بھی نصیب ہوا، اس کو نعمت غیر مترقبہ جان کر دل نے بہ صد عزت و احترام محفوظ کرلیا۔ اب یہ یادیں جو روح قلب پر نقش ہیں، باعث تسکین دل و جان ہیں جب کبھی پریشان حالی نے آن گھیرا، تو گردن جھکا کر دل کے

نقش کو دیکھا تو بھوائے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکالی دیکھ لی

اب بھی یہی حالت ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر آسودہ حال ہو جاتا ہوں۔ اپنی جوانی اور مولانا آزادؒ کی زیبائی تقریر کا نقشہ نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جوانی کی امنگیں اور طلب متاع تسکین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

(ایضاً ص ۱۶)

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

جناب ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی لکھتے ہیں

''میری وابستگی باذات مولانا آزادؒ کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ کہ میرے ایک محترم دوست ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر و مؤسس انجمن خدام القرآن لاہور نے ''الہلال'' کی مجلدات، ان کے ادارہ کو نذر کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے ان کو جواب میں لکھا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی، ساغر و مینا میرے آگے

(ایضاً ص ۲۲)

تنوع اور وسعت مطالعہ

جناب ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی تحریر فرماتے ہیں

''مولانا آزادؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل' اخلاق و سیرت اور بہترین ذہنی و دماغی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔'' غبار خاطر'' کے ایک خط میں عنایات و افضال الٰہی کے اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' اس کی نقل طوالت کا باعث ہوگی۔ یہاں ان کی ایک اور تحریر جس سے اس باب پر روشنی پڑتی ہے تحریر کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں: ''افسوس زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سروسامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم کہ میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم واز طالع دکان رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب' علوم و فنون' ادب انشاء' شاعری کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبداء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحدّ یکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔ لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا

سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد و محل آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا''۔ (ایضاً ص ۲۳)

مولانا آزادؒ کا اسلوب تحریر

پروفیسر رشید احمد صدیقی مولانا آزادؒ کے متعلق لکھتے ہیں

''مولاناؒ کی تحریر صحافتی نہیں، تصنیفی ہوتی تھی، نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ۔ مولانا کے یہاں انشاء پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ ''الہلال'' میں دعوتِ دار و رسن ہے ''تذکرہ'' میں دعوت دید و شنید ''غبار خاطر'' میں دعوتِ نوش و نشید ''ترجمان القرآن'' کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل نسرین جدا جدا

(ایضاً ص ۲۵)

فراغتے و کتابے و گوشہء چمنے

معروف سکالر جناب ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی تحریر فرماتے ہیں!

''مولانا آزادؒ کی زندگی پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک بھرپور عملی زندگی گزاری ہے، وہ ہمیشہ زندگی کے ہنگاموں میں گھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مولاناؒ کے ذوق آشنا اور مزاج شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی کے تقاضے تھے جنہوں نے مولانا کو گھیر رکھا تھا۔ مولانا اس زندگی کے ہرگز طالب نہ تھے ان کا ذوق زندگی کے ہنگاموں کے مقابلے میں خلوت گزینی کو پسند کرتا تھا۔ تنہائی ان کی مطلوب اور مطالعہ و غور و فکر اس کا

حاصل تھا وہ ۔ فراغت و کتابے و گوشۂ چمنے ..... کے دلدادہ تھے ۔ تنہائی خواہ جیل ہی کی تنہائی کیوں نہ ہو انھیں عزیز تھی اور عام ذوق و مزاج کے برعکس اس تنہائی میں اگر کوئی ساتھی مخل نہ ہو تو وہ اس کے شکر گزار ہوتے ۔ غبار خاطر کے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

''ابتداء ہی سے طبیعت کی اُفتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی' کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا ۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جاسکتے ۔ اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے' مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی ہے' جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کامجوئیوں میں لگ گئی''۔

''طبیعت کی اس افتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بے کار ہو گئے ۔ لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے ۔ کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے ۔ میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے ۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی ۔ اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے ۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا ۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا ۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب

کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا۔

مانبو دیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

''میں جب کبھی قید خانہ میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لئے سزا کیسے ہوسکتی ہے؟ اگر دنیا اس کو سزا سمجھتی ہے، تو کاش ایسی سزائیں' عمر بھر کے لئے حاصل کی جاسکیں''۔

(مکتوب مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء)۔ (ایضاً ص ۳۲)

سلطان محبت

اسلام کی تاریخ میں فتنہ تاتار سے بڑھ کر اور کوئی آفت نہیں آئی ۷۰۶ھ میں جب قتلو خان نوّے ہزار فوج کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوا۔ تو علامہ ابن تیمیہؒ اپنے درس و تدریس کے حجرے میں مصروف تصنیف وتالیف تھے۔ لیکن حملے کی خبر جونہی شائع ہوئی قلم کی نوک توڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو شمشیر جہاد کے قبضے سے بدل دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی اور حضرت اسماعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا' تو محبت جان ونفس کی پرچھائیں نظر آئی۔ عشق است وہزار بدگمانی

غیرت الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا۔

حکم ہوا کہ پہلے محبت کے مکان کو ایک ہی مکین کیلئے خالی کردو' پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کہ ''الغیرة من صفات حضرة

الربوبيّة
محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنی ہیں' اس آیت کریمہ کہ

ان اللّٰہ لا یغفرُ ان یُشرك به ویغفرُ مادون ذالك لمن یشاء' (۴۸:۴)

سلطان محبت تمام گناہوں کو معاف کرسکتا ہے۔ مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں ہے......

کیں مسئلہ در نسخۂ محمود و ایاز ست

علم وسیلہ نہیں مقصود ہے

مولانا آزادؒ کا خطاب بہ طلبائے دیوبند (۱۹۵۵)

عزیزان ملت: یاد رکھیے' دنیا نے علم کو ہمیشہ وسیلہ سمجھا' مگر مسلمانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے علم کو بھی وسیلہ نہیں سمجھا۔ بلکہ مقصد سمجھا...... علم دین وسیلہ نہیں بلکہ مقصد ہے اس کو کسی وسیلہ کے لئے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی علم کو اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے سے معیشت حاصل کریں گے یا کسی سرکاری منصب پر فائز ہوں گے۔ مسلمانوں نے ذریعہ معیشت کسی اور چیز کو بنایا اور علم کو صرف علم کیلئے سیکھا اور اسی کو اپنا مقصد بنایا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ جن کے فقہ پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں وہ بزاز تھے انہوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا

بلکہ ذریعہ معیشت پارچہ فروشی تھا۔

حضرت امام معروف کرخیؒ موچی تھے۔ آج تم اُن پیشوں کو سننے کیلئے بھی تیار نہ ہوگے۔ مگر جن امام کرخیؒ کے احترام کیلئے تمہارے دلوں کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ وہ کرخ کے بازاروں میں نکل جاتے تھے اور راستے چلنے والوں میں سے کسی کا جوتا ٹوٹا ہوا ہوتا تھا تو اس کو سی دیا کرتے تھے اور اس کی اجرت سے اپنی ضروریات پوری کرلیا کرتے تھے

شمس الائمہ کا نام حلوائی پڑ گیا تھا۔ ایک طرف خطاب شمس الائمہ اور دوسری طرف حلوائی۔ یعنی اتنا بڑا عالم حلوہ فروش بنا ہوا تھا۔ (ایضاً ص ۷۶)

ابوالکلام آزادؒ اور بلا کا حافظہ

حافظہ کس بلا کا پایا ہے۔ ''غبار خاطر'' میں نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں:

''تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعے کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا، ابھی ابھی دیکھ کر اٹھا ہوں، مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحے کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں میں، یا آخری سطروں میں نیز صفحے کا رخ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا''۔

(ایضاً ص ۵۲)

جب سیاست راست نہ آئے

مولانا آزادؒ نے فرمایا!

''ضروری نہیں کہ سیاسی کام ہی ہو۔ صحیح سیاسی زندگی ایک اجتماعی جمہوری مزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں سیاست فی الحال اونچے لوگوں کا مسئلہ ہے۔ آپ کے حالات تقاضا کرتے ہیں کہ آپ لوگ جنہیں سیاسی آب و ہوا راس نہیں، لیکن صلاحیتیں موجود ہیں۔ اپنے لئے کام کی دوسری راہیں پیدا کریں اور وہ ہے تعمیری کام، جس کی ہر گوشہء زندگی کو احتیاج ہے۔ تعلیم کو بڑھایئے اور پھیلایئے، دیہی زندگی میں انقلاب کی حد تک اصلاح کیجئے اور وہ تمام مساعی بروئے کار لایئے، جو ایک ذرا سی ہمت سے آپ کو اپنی ہی جیب و داماں میں مل سکتی ہیں، لیکن سیاسی آلودگیوں سے دامن کو بچائے رکھیے۔ بعض دفعہ صورت حالات کی خرابی اصلاح و انقلاب کیلئے کچھ مہلت چاہتی ہے، لیکن سیاسی طبیعتیں اپنے عاجلانہ اقدام سے رہی سہی متاع بھی غارت کر دیتی ہیں وہ قومیں جنہیں زندہ رہنا ہوتا ہے، محض نعروں کو اپنا شعار نہیں بناتی بلکہ ان کی منزل اس سے آگے ہوتی ہے،،۔

(ہندوستان میں ابن تیمیہؒ ص ۶۱.....از شورش کاشمیری)

صرف دو رات مطالعہ سے باز رہا

''ابن رشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تمام عمر میں صرف دو راتیں اس پر ایسی گزریں کہ وہ مطالعہ سے باز رہا۔ ایک نکاح کی رات

دوسری وہ رات جس میں اس کے باپ نے وفات پائی''۔

(ایضاً ص ۶۹)

محاسن کی تلاش

فرمایا'' میں نے لوگوں کے عیب چننے کے بجائے ہمیشہ ان کی خوبیاں تلاش کی ہیں۔ جو لذت حسن تلاش کرنے میں ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں، محاسن کی ڈھونڈھ ہی سے آدمی اپنے محاسن کو بڑھا اور چمکا سکتا ہے''۔ (مولانا ابوالکلام آزادؒ ص ۶۸، از شورش کاشمیری)

مخالفوں سے سلوک

فرمایا'' وہ لوگ جنہیں قدرت محاسن و محامد سے نوازتی ہے ان کے مخالف کمزور ہوتے ہیں، لیکن ایسے حریف لائق اعتناء نہیں ہوتے۔ انہیں جواب دینے سے جواب نہ دینا ہی بہتر ہے۔ آدمی مخالفوں سے الجھ کر کچھ پاتا نہیں کھوتا ہے۔ لڑائی افراد سے نہیں نظریات سے ہونی چاہیئے۔ جو اصولوں کے بجائے آدمیوں سے لڑتے ہیں وہ اپنے افکار و نتائج کو خود گزند پہنچاتے ہیں۔ فرمایا مخالفوں سے ذاتیات کی جنگ میں ہجو ملیح یا ہجو قبیح مزہ تو دیتی ہے مگر یہ ایک ایسا نشہ ہے جیسا بعض لوگ بھنگ پی کر سرور حاصل کرتے، ایون کھا کر سرشار ہوتے اور شیشہ شراب اٹھا کر ماورائے کائنات چلے جاتے ہیں۔ ادھر نشہ اترتا تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں پھر وہ دن سرعت سے آتا ہے جب محسوس ہوتا ہے کہ صحت کی دیوار گر چکی ہے اور اعضا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ نسخہ شفا ہے۔

دشمنوں سے کیا سلوک ہونا چاہئے وہ سب حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں ہے۔ اس کے بعد کسی مدرسے سے سبق لینے کی ضرورت نہیں، ان کا اتباع ہی اس مرض کا علاج ہے۔ میں نے اپنے حریفوں سے اعتناء ہی نہیں کیا لوگ دین کی مسند پر بیٹھ کر ژاژ خائی کرتے ہیں۔ سیاست تو دنیوی چیز ہے اور اس کی مثال میکدے کی سی ہے کہ جام ہی نہیں ٹکراتے عمامے بھی اُچھلتے ہیں۔ مخالفوں کو جواب دینے کا مطلب ہے کہ ہم نے انہیں تسلیم کرلیا اور یہ عشق مقصد کی نفی ہے۔ (ایضاً ص ۹۷)

دوستوں کا انتخاب

ایک صحبت میں کسی دوست کا گلہ کیا جارہا تھا۔ فرمایا:

''اس طرح گلہ کرنے سے انسان اپنی شکست کو نمایاں کرتا ہے دوستوں کے انتخاب میں احتیاط کرو۔ بھیڑ جمع نہ کرو، ہر شخص دوستی کا اہل نہیں ہوتا۔ لیکن دوست نہ ہو تو زندگی اجاڑ محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح زندہ رہنے کیلئے سانس لینا ضروری ہے اسی طرح دوست سفر حیات کا لازمہ ہیں''۔ (ایضاً ص ۷۸)

مخالفین کی تحسین

فرمایا: ''اپنے مخالفوں کی تحسین کیا کرو کہ یہ ان کیلئے سب سے بڑی سزا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۰۲)

پابندی اوقات

مولاناؒ سے ان کے بعض معاصروں کی خفگی کا باعث ان کا استغناء

تھا۔ وہ خلوت کے انسان تھے۔ کسی کے ہاں جاتے نہ بلاتے، اپنی انا میں اس درجہ گُم سُم تھے کہ بعض لوگ جو ابتدائی زندگی میں ان کے ہم سفر اور ''الہلال'' کے شروع میں ہم قلم تھے، اسی باعث آخر تک بگڑے رہے اور بگاڑ میں رحلت کر گئے۔ لیکن مولاناؒ اس قسم کی ناراضی کو ذہن کی مرگی کا نام دیتے اور لاعلاج گردانتے تھے۔

پابندی اوقات کا یہ حال تھا کہ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ایک دن پانچ بجے شام گاندی جی آ گئے، مولانا کو خبر کی تو جیسے ہیں ہی نہیں ٹس سے مس نہ ہوئے، فرمایا: ''اس وقت ملنے سے معذور ہوں کل صبح نو بجے تشریف لائیں''۔ گاندھی جی بھی مہاتما تھے، ہشاش بشاش لوٹ گئے اور اگلے دن نو بجے تشریف لائے

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ''ریاست'' کا مضمون ''چٹان'' میں چھپ چکا ہے کہ وہ مولانا سے طے شدہ وقت کے مطابق مل رہے تھے، اجمل خان آئے اور کہا پرائم منسٹر ہاؤس سے فون آیا ہے کہ پنڈت جی ملنے آ رہے ہیں۔ جواب دیا، بول دو کہ اس وقت کوئی عزیز بیٹھا ہے وہ نہ آئیں۔ اجمل خان جا کر اُلٹے پاؤں آ گئے اور کہا پنڈت جی روانہ ہو چکے ہیں اور راستہ میں چند منٹ پنڈت جی گوبند بلبھ پنت کے ہاں ٹھہریں گے۔ فرمایا وہاں فون کر دو کہ اب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد تشریف لائیں''۔

غرض اوقات کی پابندی مولاناؒ کے معمولات کا لازمہ تھی۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے معمول کو بھی کسی بڑی سے بڑی مداخلت پر قربان کرنے کیلئے تیار نہ ہوتے ان کا معمول تھا کہ رات جلد ہی سو جاتے۔

ہندوستان آزاد ہوا تو پندرہ اگست بارہ بجے ہندوستانی پارلیمنٹ (لوک سبھا) میں جشن عام تھا۔ چودھری خلیق الزمان بھی حلف اُٹھا کر ترنگا پرچم کو سلام کر رہے تھے، اگر کوئی غیر حاضر تھا تو وہ صرف ابوالکلام تھے، جنہوں نے برطانوی نمائندوں سے مذاکرات کے بعد یہ دن فتح کیا تھا۔

پنڈت نہرو نے دوستوں سے بیان کیا کہ مولانا اس رات سوئے بھی نہیں۔ ان کی آنکھوں سے نیند کھو چکی تھی۔ وہ اضطراب کی حالت میں کروٹ لے رہے تھے کہ ہندوستان میں انسان قتل ہو رہا تھا، انہیں اس روز سب سے زیادہ خوش ہونا چاہیئے تھا وہ اس رات سب سے زیادہ ملول تھے۔ (ایضاً ص ۸۴)

زندگی سُلگتے رہنے کا نام ہے

''زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے نہ بجھ جانے کا بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے۔ معاملہ سخن گسترانہ ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن برائی کا جواب برائی نہیں۔ لیگ کی اپنی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیئے۔ اگر سب وشتم بھی زبان ہے تو پھر قومی اخلاق کا خدا حافظ ہے۔ اس سے کوئی عمدہ فصل تیار نہ ہوگی۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہنے دو، انہیں شاید حق پہنچتا ہے، لیکن اپنی زبان کو آلودہ دشنام نہ کرو، کبھی سخت وسنگلاخ الفاظ سے قومی معاملات حل نہیں ہوتے میں جانتا ہوں آپ لوگوں کو مجھ سے اخلاص ہے لیکن اخلاص وارادت کی راہیں دوسری ہیں۔ طیش وغصہ نہیں، جن لوگوں کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے، جو دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچ رہے ہیں اور دل کی جگہ زبان سے محسوس کر رہے ہیں، انہیں ایک دن اس کا شدید احساس ہوگا اور تب وہ اپنے ہی تجربوں سے تاریخی

سبق حاصل کرلیں گے۔ بہرحال یہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے کہ آپ لوگ برہنہ دماغوں اور آوارہ زبانوں کے سامنے بازار میں ڈنر پلیں''۔ (ایضاً ص ۸۹)

زبانوں کا ہذیان

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو راقم کی موجودگی میں کہا:

''شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الٰہی ہے اور جو چیز عطیہ الٰہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہئے، جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ طعن وطنز کمزور انسانوں کی بیمار زبانوں کا ہذیان ہے۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں آپ کو ان چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگ ریزے اگلتی اور ریت پھنکتی ہیں۔ (ایضاً ص ۸۹)

مخالفین کا نہ جواب دیا نہ کتاب دیکھی

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی علمائے اہلحدیث میں نامور بزرگ تھے۔ انہوں نے ''واضح البیان'' مین مولانا کو ہدف تنقید بنایا اور جو کچھ لکھا اس کا رنگ مناظرانہ تھا مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کو مطلع کیا اور وہ اعتراضات بھی لکھ دیئے جو مولانا ابراہیم نے ترجمان القرآن کی جلد اوّل پر فرمائے تھے۔ مولانا صاحب نے مہر صاحب کو ان اعتراضات کا جواب لکھا۔ لیکن خط کے آخر میں تحریر کیا کہ براہ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجئے، میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔ ۱۹۱۸ء میں میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو

مناظرانہ طریقہ پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔ (ایضاً ص ۳۱۵)

علم و یقین

دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت ہیں۔ اس کے ماسواء جس قدر بھی ہے قرآن پکار پکار کہتا ہے کہ ''ظن'' ہے تخمین ہے قیاس ہے، اٹکل ہے ظلمت ہے، تحریص ہے، تلعب بالریب ہے۔

کتابوں کا شوق

مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنے والد کے ذوق علم و کتب بینی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''کتابوں کا شوق بھی ان کا وہ جذبہ تھا، جس کی کوئی انتہا ہم معلوم نہ کر سکے۔ دنیا کی مرغوبات میں کوئی چیز بھی ان کو اس درجہ مضطرب نہیں کر سکتی تھی، جس قدر کسی ایک کتاب کا وجود، جو ان کے ذوق کی ہو عاریت کی کتاب سے نہایت کبیدہ خاطر رہتے تھے، اور ذاتی کتاب ہی سے خوش ہوتے تھے۔

بچپن ہی سے ان کا یہ خیال رہا اور زندگی کے ہر حصے میں، خواہ عسر رہا ہو یا یسر ان کے مصارف حیات میں سب سے بڑا مصرف کتابوں کا خریدنا ہی رہا۔ حجاز عراق، مصر و شام، قسطنطنیہ اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے کتب خانے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ قسطنطنیہ اور مصر میں اتنے طویل عرصے تک یعنی سال دو سال صرف کتابوں ہی کے عشق کی وجہ سے رہے۔ قسطنطنیہ کے کتب

خانوں کا حال جب بیان کرتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہاں سے اٹھ کر آئے ہیں۔ کہتے تھے کتب خانہ جامع ایا صوفیا اور کتب خانہ جامع فاتح، اور کتب خانہ جامع بایزید مہینوں تک میرے تمام تمام دن کا مسکن رہے ہیں۔ سرکاری طور پر انہوں نے ہر طرح کے مطالعہ اور تصرف کا خاص پروانہ حاصل کیا تھا اور کتب خانے کے سرکاری کاتبوں کو سلطانی حکم مل گیا تھا کہ جن جن کتابوں کی نقلیں یہ چاہیں، سلطانی خرچ سے دے دی جائیں چنانچہ تقریباً دو سو قلمی کتابیں وہاں سے لائے، جن میں بہت سی خود ان کے ہاتھوں کی ہی نقل کی ہوئی تھیں۔ تفسیر یاقوت التاویل کا وہ نسخہ، جو امام غزالی کی طرف منسوب ہے لیکن میں اسے امام صاحب کا نہیں سمجھتا، اس کی سات جلدیں، جامع ایا صوفیا میں ہیں۔ ایک جلد والد مرحوم کے خود ہاتھ کی نقل کی ہوئی ہم نے دیکھی اور باقی دوسرے کاتبوں کی۔ اسی طرح تفسیر و فقہ و عقائد کی دو سو کتابیں قسطنطیہ سے لائے تھے، جن میں زیادہ حصہ تفسیر کا تھا۔

مصر کے کتب خانے میں بھی انہوں نے متعدد کتابیں خود نقل کیں، اور لوگوں سے نقل کرائیں۔ شوق کتب میں آکر مصری مطبوعات اس قدر خریدیں کہ مصر سے واپسی کیلئے ان کے پاس خرچ بالکل نہیں رہا۔ آخر اور تین مہینے قرض کر کے ٹھہرنا پڑا، یہاں تک کہ بمبئی سے روپیہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

حافظ صاحب کہتے تھے کہ ہر سفر میں ان کے ساتھ دس دس پندرہ پندرہ صندوق کتابوں کے آیا کرتے تھے۔

کتابوں کی ظاہری صورت کا بھی نہایت شوق تھا۔ اگر ایک کتاب ان کے پاس موجود ہے اور اب اس کا کوئی اور قیمتی ایڈیشن نکلا، تو اسے ضرور خرید لیں گے، خواہ کتنی ہی قیمت ہو۔ فتح الباری ان کے پاس قلمی تھی، جو وہ قسطنطیہ سے لائے تھے اور اس کا مقدمہ خود ان کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا تھا، لیکن جلد ساز نے جلد باندھتے ہوئے اس کا حاشیہ خوبصورتی کیلئے بہت کاٹ دیا۔ اس کا ان کو بہت شوق تھا کہ کتابوں کا حاشیہ بڑا رہے اور اس میں بڑا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ دوبارہ دوسرا نسخہ خریدا۔ قاضی زادہ کا حاشیہ ''بیضاوی'' آٹھ جلدوں میں چھپ رہا تھا تو یہ قسطنطیہ ہی میں تھے اس کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ جلد ساز نے اس کی جلد خراب باندھی، لہٰذا دوسرا نسخہ خرید لیا۔ اب تک دونوں نسخے میرے پاس موجود ہیں۔

اس زمانے میں کلکتہ انگریزی قسم کی جلد سازی میں مکے تک مشہور تھا اور واقعی، اس سے بہتر جلد اور کہیں نہیں بندھتی تھی۔ جب والد مرحوم مکہ معظمہ میں تھے تو وہاں سے بے جلد کی کتابیں کلکتے میں صرف جلد باندھنے کیلئے بھیجی ہیں اور یہاں سے جلد بندھ کر گئی ہے چنانچہ ان کی کتابوں میں سیکڑوں جلد سرخ ولایتی پشتے اور سبز کپڑے کی، جو انہیں بہت مرغوب تھی۔ وہی جلدیں جو اثنائے قیام حجاز میں کلکتے سے جلد بندھ کر گئی تھیں۔ ایک والئی ملک کیلئے یہ انتظام عجیب نہ ہو، لیکن ایک عالم کیلئے یقیناً غیر معمولی ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی کے ہر حصے میں دولت دنیا کی طرف سے ایسی فارغ البالی

پائی تھی جو علماء و مشائخ کو بہت کم میسر آتی ہے، لیکن ان کی تمام دولت کتابوں ہی میں خرچ ہوئی۔

تاریخ کبیر بغداد للخطیب ، تاریخ کبیر دمشق لابن عساکر طبقات الشافعیہ لسبکی ، جمع الجوامع للسبکی ، مشکل الاثار للطحاوی تصنیفات ابن عربی کے علاوہ فتوحات وفصوص، مصنفات امام غزالی کے علاوہ کتب متعارفہ ، تہذیب للحافظ مزی تاریخ للذہبی تفسیر سراج المنیر وغیرہ بہت سی نایاب کتابیں انہوں نے بڑے اہتمام سے نقل کروائیں۔ کتب خانہ محمودیہ، کتب خانہ حرم، کتب خانہ باب السلام کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی ، جسے انہوں نے نقل نہ کرالیا ہو۔ خود لکھتے تھے کہ تاریخ صغیر امام بخاری کا ناتمام نسخہ، کتب خانہ محمودیہ میں ہے، لیکن میں نے کتب خانہ جامع سے مکمل نسخہ نکال کر اپنا نسخہ مکمل کرلیا فتوحات انہوں نے تصحیح کر کے ''مطبعہ بولاق میری'' میں چھپنے کو دیدی۔

انہوں نے نجم المبین کے مقدمے میں اپنے ماخذ کی فہرست دی ہے جس میں صرف تفسیر کی کتابیں دوسو کے قریب ہیں اور وہ یہ ہیں جوان کے مطالعہ میں آئیں۔ ماأهل به لغير الله کے مبحث میں سو کے قریب تفسیروں کے اقوال نقل کئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے حالات پیش آئے ، کہ اس نایاب کتب خانے کا جو مقدار کے لحاظ سے بڑے بڑے تیس صندوقوں میں ایک مرتبہ بند ہوا تھا، بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ جب دوسری مرتبہ حجاز سے آئے اور کئی سال کے بعد واپس گئے تو کتابیں چونکہ صندوق میں بند تھیں اور لوگوں نے

ان کی کافی نگہداشت نہ کی تھی اس لیے علم کے سب سے بڑے دشمن یعنی کیڑوں کو حملے کا موقع مل گیا۔ آخری مرتبہ جب ہندوستان آئے، تو ایسے حالات پیش آئے کہ یہاں کے قیام نے بہت طول پکڑا پہلا تجربہ چونکہ ہو چکا تھا، اس لئے انہوں نے اپنے معتمدین کو یہاں لکھا اور کتابوں کی فہرست بھیج دی کہ انہیں کتب خانہ محمودیہ میں داخل کر دیا جائے۔ شریف عون کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور اس نے طرح طرح کی کاروائیاں ذاتی مطامع کی اختیار کر رکھی تھیں، چنانچہ چاہا کہ یہ کتابیں بھی خود اس مد سے کتب خانے میں رکھ دے، جو اپنے نام سے اس نے وہاں قائم کیا تھا تب والد مرحوم نے حاجی محمد قاسم کو جو جدے کے بہت بڑے تاجر اور رئیس تھے اس کام پر مامور کیا اور انہوں نے بڑی کوشش کر کے ان کتابوں کو کتب خانہ محمودیہ میں داخل کیا۔ لیکن یہاں ہندوستان آ کر دس پندرہ برس کے عرصے میں سترہ اٹھارہ صندوق اور کتابوں سے بھر گئے تھے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو ان کے کتب خانہ حرم میں موجود تھیں۔ یہاں ضرورت پیش آئی یا عمدہ ایڈیشن چھپ گیا اور مکرر خرید لیں۔ کتابوں کے شوق کی وجہ سے آخر تک یہ حال تھا کہ جس زمانے میں بینائی کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ مطالعہ بالکل نہ کر سکتے تھے اور آئندہ بھی مطالعے کیلئے عمر کی کوئی مہلت نظر نہ آتی تھی، اس پر بھی ہم لوگوں نے جوں ہی کسی کتاب کا ذکر کیا، فوراً اسے خرید لیتے تھے۔ اردو کتابوں سے بالکل رغبت نہ تھی، بلکہ ایک طرح کی حقارت ان میں نظر آتی تھی۔ وہ تصور ہی نہیں کر سکتے

تھے کہ کوئی عالم، عالم ہو کر اردو میں بھی کتابیں تصنیف کر سکتا ہے۔ کہتے تھے کہ یہ صرف عوام کیلئے ہے، لیکن اس پر بھی اگر کوئی کتاب موضوع کے اعتبار سے ان کے خیال میں جچ جاتی، تو ہم لوگوں کی ترغیب جو زیادہ تر اپنے ذاتی مطالعے کی طمع سے ہو جاتی تھی، ضائع نہیں جاتی تھی۔ تمدن عرب کا ترجمہ جب شائع ہوا، تو اس کی قیمت پون روپیہ تھی۔ ہماری استطاعت سے باہر تھا کہ اسے منگواتے۔ اس کی فہرست بطور اشتہار کے چھپی تھی۔ ایک دن انہیں خوش دیکھ کر میں نے خبر سنائی کہا کہ بیکار ہے، مگر منگوالو۔ لیکن افسوس یہ چیز بھی بری طرح ضائع ہوئی۔ آخری مرتبہ جب بمبئی سے کلکتہ آئے، تو تمام سامان بمبئی میں چھوڑ آئے تھے۔ جب انتقال ہوا، تو عرصے تک بعض مجبوریوں کی وجہ سے بمبئی نہ جا سکا۔ بعض اور اعزہ وہاں چلے گئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں گیا، تو دو بڑے ہال جو طرح طرح کے سامانوں سے بھرے ہوئے تھے، ان میں بجز خالی صندوقوں کے اور کچھ نہ تھا، یا تھوڑی سی بچی بچائی کتابیں رہ گئی تھیں۔

یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ والد کو اچھی اشیاء کا بہت شوق تھا۔ خود بھی خریدتے تھے اور ظاہر ہے، دور دور سے ہزاروں معتقدین طرح طرح کی قیمتی چیزیں تحفۃً بھیجتے تھے۔ پرانی کشمیری کام کی شالوں سے جواب ناپید ہیں، ایک پورا صندوق بھرا رہتا تھا قیمتی قالین، دریاں، ہاتھی دانت اور صندل کی طرح طرح کی اشیاء ڈھاکے اور مرشد آباد کے قیمتی کپڑے، مراد آباد اور بنارس کے برتن اور دوسری طرح طرح کی چیزوں سے صندوق کے صندوق

بھرے ہوئے تھے ۔ لیکن انتقال ے بعد مجھے ان میں کوئی ایک چیز بھی نہیں ملی ۔ اس کا مجھے کچھ افسوس نہ ہوا، لیکن کتابوں کے تلف ہونے کا بہت ہی افسوس ہوا ہے ۔ یہ کتابیں ٹوکروں میں ڈال ڈال کر بازار میں فروخت کی گئیں ۔ میں نے بعد میں بہت کوشش کی کہ سراغ ملے، تو واپسی کی کوشش کروں اور ایک حد تک سراغ ملا بھی لیکن کتابیں نہ مل سکیں ۔ بہر حال یہ کار خیر ہوا کہ ان کی کتابوں کا اوّلین ذخیرہ مکہ معظمہ میں عام مطالعے کیلئے وقف ہوگیا۔

(آزادؒ کی کہانی خود آزدؒ کی زبانی ......ص ۱۰۴)

ناشتے کے پیسے کتابوں پر

مولانا آزادؒ بیان فرماتے ہیں......

''دس برس کی عمر میں مجھے کتابوں کا اتنا شوق ہوگیا تھا کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے تھے، ان کو جمع کرتا تھا اور ان سے کتابیں خریدتا تھا۔ اس اثناء میں جیسا کہ آگے آئے گا مجھے اردو کتابوں کے مطالعے کا شوق ہوا۔ یہ بھی گویا ایک سخت تعلیمی ''بدچلنی'' تھی، جس کو ہم صرف ایک جرم کی طرح محض مخفی طور پر ہی کر سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ شوق بھی کھیل کود کا شوق نہ تھا!

اس وقت یہ حال تھا کہ صبح کو اٹھ کر والد مرحوم سے سبق لیتے تھے، اس کے بعد ہی باہر کے سبق کا وقت آتا تھا۔ دوپہر کو مطالعے اور یاد کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ سہ پہر کو پھر والد مرحوم بلاتے تھے اور باہر جو کچھ پڑھ چکے ہیں اسے سنتے تھے یا بغیر کتاب کے

ویسے ہی معلومات کی باتیں سناتے، یا اور کوئی مفید تذکرہ چھیڑ دیتے مغرب کے بعد پھر ایک سبق والد مرحوم کے پاس ہوتا۔ اب جو وقت رہ گیا وہ صرف سونے ہی کا ہے۔ اپنے شوق مطالعہ کیلئے صرف اسی میں بچت نکل سکتی تھی؛ چنانچہ میں اپنے بستر کے نیچے کتابیں رکھتا اور موم بتی جلا کے مطالعہ کرنے لگتا۔ اگر دن کو اور مطالعہ کرتا رہا، تو درسی کتابوں کا شب کو مطالعہ کرتا۔ اکثر ایک ایک دو دو بجے تک مشغولیت رہتی۔ اس کی وجہ سے اسی وقت سے میری صحت میں فتور آنے لگا تھا۔ یہ ٹھیک دس سے لے کر بارہ برس کی عمر کا واقعہ ہے۔

والد اس کے بہت مخالف تھے۔ تاہم درسی کتابوں کی تحصیل کی بھی جتنی مقدار تھی، اس میں حفظ صحت اور تفریح کا کہاں وقت نکل سکتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ طبیعت کو ابتدا ہی میں جب اس طریق پر ابھرنے کا موقعہ نہ ملا، تو اس کے تمام جذبات مرجھا گئے اور پھر اس طرف ایسے لگے کہ تمام جذبات کا مصرف، مطالعہ و درس ہی ہو گیا۔ والد مرحوم کو کچھ کچھ پتہ چلا کہ میں درسی کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں دیکھتا ہوں۔ تو وہ مانع ہوئے اور اس کی نگرانی کرنے لگے۔ (ایضاً ص ۱۲۱)

مطالعہ اور حیلہ جوئی

مولانا آزادؒ رقمطراز ہیں:

اس زمانے میں شوق و محویت کا یہ حال تھا کہ رات کو دو دو بجے تین تین بجے تک یہ کتابیں ہوتی تھیں اور میرے بستر کے سرہانے

ٹمٹماتی ہوئی موم بتی ۔ دن کو درسیات کی مشغولیت کی وجہ سے نیز والد مرحوم کی نگرانی اور ہیبت وسطوت سے مطالعے کی مہلت نہیں ملتی تھی ، اس لئے اس کی کسر رات ہی کو نکلتی تھی مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں رمضان آ گیا تھا ۔ اس کے ایک سال پہلے میں نے پورے روزے پہلی مرتبہ رکھے تھے ۔ دوسرا رمضان تھا ۔ عشاء کے بعد میں مطالعہ شروع کرتا اور دو ڈھائی بجے ختم کرتا ۔ جب سحری کرنے کیلئے ماما بلانے آتی ۔ ایک مرتبہ والد مرحوم صحن سے جاتے ہوئے سامنے سے گزرے ایک بجا ہوگا ۔ ان کی نظر میرے بستر پر پڑ گئی ، دیکھا کہ میں دونوں کہنیاں تکیے پر رکھے کتاب دیکھ رہا ہوں ۔ انہوں نے وہیں سے پکارا اور کہا ، رات کے وقت کیا دیکھ رہے ہو ، کون سی کتاب ہے ؟ مجھے اپنی یہ چالاکی اور حیلہ جوئی اب تک یاد ہے کہ میرے سرہانے مختصر المعانی بھی تھی ، میں نے فوراً کہہ دیا کہ مختصر المعانی ۔ (ایضاً ص ۱۵۶)

''حیات جاوید'' کے لیے بے تابی

مولانا آزادؒ اپنے ذوق علم ومطالعہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈیوٹی شاپ کو میں نے پیشتر سے خط لکھا تھا کہ بجر داشاعت میرے نام وی پی بھیج دیں ۔ پھر کھٹکا ہوا کہ کہیں تاجرانہ اصول پر احتیاطاً منظوری کی تجدید نہ کرنا چاہیں ، اس طرح ایک ہفتے کی اور دیر ہو جائے گی ۔ پھر انہیں ایک خط لکھا اور اس میں صراحت کر دی کہ بلا کسی اطلاع کے وی پی بھیج دیں ، لیکن بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے

کہ اس کی منیجر کو بھی میرا شوق دیکھ کر ستم ظریفی سوجھی تھی۔ ایک دن ایک کارڈ ملا کہ حیات جاوید چھپ کر تینوں قسم کی آ گئی ہے۔ آپ کی درخواست درج رجسٹر ہے، اگر مطلوب ہو تو بھیج دی جائے؟ میں اس غم و غصہ کو کیونکر بیان کروں، جو اس دن مجھ پر طاری ہوا۔ اگر کوئی ذریعہ بھی ایسا ہوتا کہ چھ دن کی تاخیر کی جگہ ایک دن کے اندر علی گڑھ سے کتاب مجھے پہنچا دی جاتی، تو میں اپنے تئیں بیچ کر بھی اسے حاصل کرتا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ سمجھ کر کہ کم از کم تین دن کی تخفیف ہو جائے، تار لکھوایا اور بھیج دیا آخر چار دن کے بعد پارسل آیا۔ پیون تک کی صورت، اس کے کاندھے کا بوجھل تھیلا اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پارسل، اس زمانے میں میری آنکھوں کے لیے دنیا کا سب سے زیادہ حسین منظر تھا، جس کے انتظار میں کوئی روح بے چین رہ سکتی ہے اور جس کے آمد پر کوئی آنکھ استقبال کر سکتی ہے۔

میں اب بھی اس عالم کو یاد کرتا ہوں۔ کلکتے میں چٹھی رسانوں کا یونی فارم خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ سر پر بھی خاکی پگڑی ہوتی ہے۔ یہ مجھے خواب میں بھی نظر آتا اور اس پوشش میں کچھ عجب کشش میرے لئے پیدا ہو گئی تھی۔ عموماً پوسٹ صبح کو ملتا جس میں پارسل کی روانگی کی اطلاع ہوتی تھی۔ پارسل یا تو اسی دن دوپہر کو آتا یا دوسرے دن۔ معاملے کی یہ توسیع میرے لئے بڑی باعث کشش ہو گئی تھی۔ جی چاہتا کہ آج ہی آئے۔ دوپہر کے وقت میں اپنا مطالعہ لے کر نیچے کمرے میں یا باہر کے ایک تخت پر جو بچھا رہتا تھا، بیٹھا کرتا، محض

اس انتظار میں کہ پیون کے آنے پر بلا ایک لمحہ تاخیر کے میں اس کا استقبال کرسکوں۔

خوش قسمتی سے ''حیات جاوید'' کے لیے دوسرے دن کا انتظار نہ کرنا پڑا پارسل جب ہاتھ میں آیا، تو وہ وقفہ جو اس کی بندش کے کھولنے میں لگا اور وہ لمحہ مضطرب، جو اس کی لوح کے دیکھنے کے وقت طاری ہوا، مجھے اب تک نہ صرف یاد ہے، بلکہ محسوس ہو رہا ہے میں نے اسے روپیہ بھی نہیں دیا اور پارسل لے کر اوپر بھاگا۔ ''حیات جاوید'' ایک ہزار صفحے میں ختم ہوئی ہے۔ میں نے دو شب میں ختم کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول پر کم سے کم ایک وقت کا کھانا ضرور فراموش ہو جاتا تھا، اس دن بھی میں نے شام کا کھانا نہیں کھایا، اس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا۔ ''حیات جاوید'' تین قسم کی چھپی تھی، درجہ اوّل مجلّد بارہ روپیہ تھا۔ میرے پاس درجہ دوم کا نسخہ تھا، کمال شوق میں درجہ اوّل بھی منگایا۔ ۱۹۰۱ء کی بات ہے''۔ (ایضاً ص ۱۵۷)

ذوق کتب بینی اور بھائیوں میں رقابت

مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:

''بسا اوقات کھیل کود، لہو لعب، یا زیادہ عمر ہوئی، تو تمتعات دنیوی یا اور مقاصد حیات، عزیزوں اور بھائیوں میں رشک و مقابلے کا باعث ہو جاتے ہیں، لیکن ہم ابتداء سے ان تمام راہوں سے نابلد تھے۔ اس وقت تمتعات زندگی میں سے اگر کوئی چیز تھی، تو

وہ صرف مطالعہ اور جمع کتب کا شوق تھا، چنانچہ بات عجیب سمجھی جائے گی کہ ہم دونوں بھائیوں میں مقتضیات عمر سے اگر رشک و مقابلے کا جذبہ پیدا ہوتا بھی تھا، تو اسی چیز میں۔ دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں اور اس کی کیفیت وکمیت میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ اس زمانے میں خیالات بھی عجیب تھے۔ کتاب بہرحال مطالعے کیلئے ہے اور ایک نسخہ لاکھوں دماغوں کیلئے مفید ثابت ہوسکتا ہے، لیکن ہمارے شوق نے رقابت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ایسا ہوتا کہ مثلاً بھائی مرحوم کوئی نیا ذخیرہ کوئی نئی کتاب مطالعے کی کوئی نئی شکل پیدا کرتے اور اس پر مجھے رشک ہوتا اور میری سعی بھی ہوتی کہ نہ صرف اسے حاصل کروں بلکہ ان سے بڑھ کر کوئی اور کامیابی پیدا کرلوں۔ یہی خیال ان کا بھی تھا۔ اس میں بعض اوقات تکرار اور نزاع بھی ہوجاتی تھی۔ کبھی کبھی تکرار یہاں تک طول پکڑتی کہ والد کی مداخلت تک نوبت آجاتی۔ وہ اگرچہ بہت سمجھاتے کہ کتابوں کے لئے حسد ونزاع کس قدر فضول ہے لیکن ہم لوگ اس پر قانع نہ ہوتے۔

مقصود یہ ہے کہ زندگی کے اس حصے میں جو قویٰ اور اہواء کے ابتدائی عہد ظہور ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں اور خواہشوں کا مرکز ہوتا ہے ہمارے لئے صرف مطالعہ وکتب میں محصور تھا۔ تمام جذبات بالطبع انہیں میں صرف ہوتے تھے۔ آگے چل کر پھر یہ مقابلہ، شاعری اور تحریر مسائل میں بھی ہونے لگا۔" (ایضاً ص ۱۶۳)

کتابوں پر نوٹ

مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:

''والد مرحوم ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ بلا نوٹ کرنے کے بھی مطالعہ نہ کرو، اگر لکھنے کیلئے کوئی بیاض نہ ہو تو کتاب کے صفحے پر ہی لکھو۔ صفحے میں لکھنے کیلئے گنجائش نہ ہو تو صرف ایک نشان ہی دیدو ،مگر کوئی نہ کوئی قلم کا عمل ضرور کرو۔ اس طرح کتاب کے تمام مباحث ہمیشہ کیلئے محفوظ رہیں گے۔ خود والد مرحوم کا مدت العمر یہی طریقہ رہا۔ ان کے کاغذات میں صدہا بیاضیں محض مطالعے کے نوٹ ہیں۔ وہ اتنے مختصر ہیں کہ اب بدقت سمجھ آسکتے ہیں۔ تاہم نوٹ ہیں اور ان کے تعب انگیز استحضار وعظ کا اصلی بھید انہی میں پنہاں ہے۔ اس کے بعد میری بھی یہ عادت ہوگئی کہ جب کبھی کسی چیز کو یاد رکھنا چاہا، تو ایک مرتبہ لکھ لیا۔ پھر وہ چیز محفوظ ہوگئی۔ ایک زمانے میں مجھے حفظ قرآن کا شوق ہوا تھا۔ حافظوں کی طرح رٹنا تو دشوار تھا۔ میں نے ایک ایک رکوع لکھنا شروع کیا اور اس طرح سورتیں کی سورتیں بلا بار بار تلاوت کے حفظ ہوگئیں۔ دو تین رکوع دن میں نقل کر لیتا اور عشا اور صبح کی نماز میں اسے دہرا لیتا زبانوں کی تعلیم میں بھی یہ طریقہ ذہین طبائع کیلئے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہے''۔ (ایضاً ص ۱۶۷)

ایک درد دل اور حسرت:

مولانا آزادؒ کا بیان ہے:

''اس زمانے میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی شروع ہو چکا

تھا، اس لئے اس سے اس شوق کو مزید تحریک ہوئی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ کوئی معین تحریر اس قسم کی کب لکھی، لیکن ۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں شوقیہ کاغذ سیاہ کرتا رہتا تھا، مگر کسی تحریر کو بغرض اشاعت بھیجنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں آج کل جب کبھی اپنے اُس زمانے کے شوق اور باقاعدہ تعلیم و ہدایت کے فقدان اور موجودہ زمانے کی ترقی یافتہ درس گاہوں کے طریق پر غور کرتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ کاش ایسے وسائل مجھے اس وقت بھی ملے ہوتے۔ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے لوگ اس محرومی کا بالکل اندازہ نہیں کر سکتے، جو ہم لوگوں کو اپنے تعلیمی عہد میں پیش آئی۔ موجودہ زمانے میں مضمون نویسی بھی تو قواعد زبان کا ایک ضروری جزو بن گئی ہے۔ انگریزی میں تو بعض مصنفین گرامر نے اس کے قواعد کو بھی صرف ونحو ہی کے سلسلے میں منضبط کیا ہے۔ جدید کتب قواعد ادب اور فنون بیان وانشاء میں ایک مستقل موضوع درس ہے اور اسکولوں میں اسی طرح باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور درساً مشق کرائی جاتی ہے، جیسے اور فنون عالیہ کی۔ ایک انگریزی سکول کا تعلیم یافتہ کتنا ہی محروم و ناقص ہو، لیکن وہ قواعد اور مبادیات کتاب سے ضروری واقف ہوگا، گو اپنی کند ذہنی اور عدم مناسبت کی وجہ سے اس سے کام نہ لے سکے، لیکن ہمیں یہ بات کہاں نصیب تھی؟ قدیم عربی درس گاہوں میں اس کا وہم وگمان بھی کسی کو نہیں ہوتا اور ہم نے تو باقاعدہ مدارس میں بھی تعلیم نہیں پائی، نہ کوئی تعلیم تھی، نہ کوئی ہدایت، نہ کوئی مشورہ، نہ کوئی صحبت، نہ نکتہ چیں اور مصلح نگاہ، محض ذاتی شوق اور خود اپنے ذہن کا ذاتی مراقبہ۔ (ایضاً ص ۶۹)

افکارِ آزاد

دل و دماغ کا فاصلہ

''عزیزو! میری آواز اس آلہ جہیر الصوت کے ذریعے آپ کے اس فقید المثال اجتماع کا آویزہ گوش ہو سکتی ہے۔ مشرق و مغرب تک جا سکتی ہے شمال و جنوب تک پہنچ سکتی ہے۔ پھر ثریا کی بلندیوں تک اُڑ سکتی ہے اور ثریٰ کی پستیوں میں اُتر سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ کا فاصلہ کس قدر ہے، کوشش کرو ں کہ اپنی آواز ان تک پہنچا سکوں''۔ (مولانا ابوالکلام آزاد ص ۲۴۹ از شورش کاشمیری)

لذت آشنائے درد

دل جب لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے، جو پانی بن جاتی ہے لیکن آگ نہیں ہو سکتی۔ (ایضاً ص ۲۴۹)

مسلمان

مسلمان کئی صدیوں سے اس حالت میں رہ رہے ہیں کہ آندھی کی طرح اُٹھتے، طوفان کی طرح چھا جاتے اور گرد کی طرح بیٹھ جاتے

ہیں۔ (ایضاً)

سیاست دان

عربی ضرب المثل ہے، سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ انسانی تجربوں کی طویل تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے، ادھر ہندوستان کے سیاسی تجربوں سے ایک اور بات آشکارا ہوئی کہ سیاستدان صرف اپنے ہی مستقبل پر سوچتے ہیں۔ انہیں تاریخ کے اجتماعی عمل سے کہیں زیادہ اپنے ذوق کی انفرادی نمائش مطلوب ہوتی ہے۔ (ایضاً)

چلنا سیکھنا ہوگا

ہمارے ہاں سیاست میں بعض تنظیمیں دوڑتی ہے یا بہتی ہیں، انہوں نے ابھی چلنا نہیں سیکھا، جس دن چلنا سیکھ لیا، ان کا سفر آسان ہو جائے گا اور منزل خود بخود سامنے آجائے گی۔ (ایضاً ص ۲۴۹)

جو کھوتے ہیں وہ پاتے ہیں

جو کھونا نہیں جانتے وہ پانے کا مزہ کیونکر لے سکتے ہیں۔ جس نے کبھی کانٹے کی چبھن نہیں دیکھی، وہ تلوار کے زخموں کی روداد کیونکر بتا سکتا ہے۔ دریا میں اُتر کر ہی تیرنا آسکتا ہے۔ تم یہ چاہو کہ پاؤں گیلے نہ ہوں، پانی بدن کو چھوئے نہیں اور کنارے پر کھڑے کھڑے تیرنا سیکھ لو، تو یہ ممکن نہیں۔ اسلام کی سربلندی کا راز ساحلوں پر کھڑے ہو کر دریاؤں کا پیچ و تاب دیکھنے میں نہیں، اس کی سرفرازی کیلئے تمہیں طارق کی طرح اپنی کشتیاں جلانا ہوں گی، کچھ کھو کر ہی پا سکتے ہو۔ (ایضاً ص ۲۵۰)

فقدان ہمت کا نام تقدیر

میں ستاروں کو الفاظ بنا سکتا ہوں اور چاندنی ان کی آواز ہو سکتی ہے۔ اسی طرح صبا میرا لہجہ بن سکتی ہے۔ ہمالہ کی بلندی میرے خیال کا اُفق ہو سکتی اور سمندر کی تہ میرے فکر کا عمق، لیکن تمہارے قدم میرا ساتھ نہیں دیتے، شاید تمہاری لغت میں فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔ (ایضاً)

بڑی بولی کے منتظر

ابھی تاریخ کی صبح طلوع نہ ہوئی تھی کہ ہندوستان میں حلقہ بگوشانِ اسلام گنگا و جمنا کے کناروں پر وضو کرتے نظر آ رہے تھے۔ انہی لوگوں کی بدولت اس سرزمین میں اسلام نے اپنے قدم جمائے تھے۔ پھر اس کے میدانوں میں ان شہسواروں ہی نے تاریخ کے شب و روز اجالے تھے۔ آج تم ہو کہ سیاست کی منڈی میں جنس کی طرح پڑے ہو اور تمہیں انتظار ہے کہ بڑی سے بڑی بولی کون دے سکتا ہے؟ (ایضاً)

یک جان و دو قالب

اسلام نے جو معاشرہ تیار کیا، یہ اس کا شرف تھا کہ افریقہ کا بربر اور حجاز کا بدو یک جان و دو قالب ہو گئے اور ہندوستان کا اچھوت مشرف بہ اسلام ہو کر خاک طیبہ کے سادات سے منسلک ہو گیا۔ جب تک مسلمانوں کے معاشرے میں اس خصوصیت کی آب و تاب ماند نہ ہوئی ان کے سر پر کلاہ خسروی رہا اور دنیاوی عزتوں کے بہت سے خزانے ان کے پاؤں میں ڈھیر ہوتے گئے۔ جونہی وہ اس سے دستبردار ہوئے اور

انہوں نے شخصی شرف ومجد کے بُت تراش لئے، ان کا معاشرہ اقوامِ عالم کیلئے عبرت کی ایک ایسی کہانی ہوگیا کہ آج دوسری کوئی داستان اس درجہ غمناک نہیں ہے۔ (ایضاً)

ملّتِ واحدہ

ہم مسلمان جہاں تہاں آباد ہیں، ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک تک حکمرانی تقسیم کے علی الرغم ملّت واحدہ ہیں، وہ زخم جو انقرہ میں کسی ترک کو لگتا ہے، اس کا لہو دہلی میں ایک مسلمان کے سینے سے رستا ہے اور وہ کانٹا جو مراکش میں کسی فرزندِ توحید کو چبھتا ہے، اس کی ٹیس ہندوستان کے مسلمان کو ہوتی ہے۔ (ایضاً)

مسیحی عزائم اور استعماری مقاصد

برطانیہ اور فرانس! جی نہیں، یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمت عملی وضع کی ہے اور اس کا نام مشرقی مسئلہ رکھا ہے اس کی غایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے بقیہ قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے۔ بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جس قدر حصے اسلام کے زیر اثر باقی رہ گئے ہیں انہیں یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی تقسیم مساوی کے ساتھ ساتھ آپس میں بانٹ لیں جس شخص نے کم از کم گزشتہ دس برس کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ بغیر کسی مزید بصیرت کے پورے یورپ کے مسیحی عزائم اور استعماری مقاصد کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۱)

اقوامِ یورپ سے خطاب

اے اقوام یورپ! اے دزدان قافلہ انسانیت! اے مجمع وحوش و

کلاب ظلم و عدوان تا بہ کے؟ اور خون ریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے، کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی، تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر لٹک رہی ہیں۔ طرابلس کی ریت پر اب تک اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں، جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک پیش رو نے بہایا، مراکش میں ان لاشوں کا شمار کوئی انسان نہیں کر سکتا جن میں سینکڑوں کو تمہارے گھوڑوں کے سموں کی پامالیاں اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں۔ (ایضاً)

مقدس ہاتھ

تلوار کی صداقت کسی عہد میں ضعیف نہیں ہوتی، وہ ہاتھ نہایت مقدس ہیں، جن میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہے۔ لیکن زندہ وہی رہ سکتا ہے جس کی مٹھی میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ (ایضاً ص ۲۵۲)

برطانوی استعمار کی جماعت

برطانوی استعمار نے ہم مسلمانوں میں ایک جماعت تیار کی ہے اور یہ لوگ وہ ہیں جو دنیوی عزت کیلئے دینی غیرت کا جوا کھیلتے ہیں۔ جن کے لئے ملت کا وجود ایک بازیچہ ہے، ہوائے نفس آلہ زینت ہے۔ حکام و امراء معبود ہیں، درہم و دینار قبلہ ہیں۔ غلامی و تعبد ان کی شریعت ہے اور قریش مکہ کے صامت و ساکت بتوں کی جگہ سمندر پار سے آئے ہوئے متحرک بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ جو وحی الٰہی کی جگہ شملہ کے سماء سے اترے ہوئے احکام و فرمان کو اپنی کتاب و سنت یقین کرتے ہیں اور

جن کے قلوب اصابع الرحمٰن کی جگہ اصابع الشیطان میں ہیں۔
(ایضاً ص ۲۵۲)

تاریخ کے اوراق

تاریخ پلٹے کھا رہی ہے، وقت کے دامن میں غضب ناک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اور آشیانوں پر کوندنے کیلئے مضطرب ہیں، اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار رکھو، اللہ کے قانون تمہارے لئے بدل نہیں سکتے، وہ اٹل ہیں۔ جو لوگ مقصد کے سفر میں ایمان، حق اور صبر کی راہوں سے گزرتے ہیں، ان کے قدم کسی موڑ پر ڈگمگاتے نہیں ان کیلئے کامیابی آگے بڑھ کر اپنے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھا دیتی اور نصرت الٰہی معین ہوتی ہے (ایضاً)

قیامت سے پہلے قیامت۔

میں علی گڑھ سے آرہا تھا اور آگرہ کے حدود میں تھا، جمنا کو دیکھا تو ایکا ایکی رنگا رنگ خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔ ایک تصور میں ڈوب گیا۔ جمنا میں اس وقت اتنا پانی بھی نہ تھا جتنا ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ جمنا اسی طرح بہہ رہی ہے، جیسا کہ صدیوں سے بہتی آرہی ہے، لیکن سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ ذرا دیکھو کہ اسی فضا میں ایک بہترین آواز اور اس کی زبان موجود ہے۔ اس کے پاٹ میں عبرت کے ورق کھلے ہوئے ہیں، گو ان کی زبان نہیں، لیکن فصاحت کا مجسمہ ہے پھر ان عمارتوں پر نگاہ ڈالو جو آگرہ اور اس کے نواح میں تمہاری فرمانروائی کی یادگار ہیں۔ ان کی آواز سنو، تاریخ پکار رہی ہے۔ ان کے کھنڈر تمہاری گزشتہ عظمت کا ماتم کر رہے ہیں۔ ان کے چہروں کا رنگ و نور

گریہ سے اڑ چکا ہے۔ ادھر وہ شاہجہان کا مدفن ہے، کیا اس سے بڑھ کر کوئی زبان ہوسکتی ہے؟ جو تمہارے کانوں کو مخاطب کرسکتی ہو۔ آگرہ کا چپہ چپہ تاریخ کا امانت دار اور اس کا ذرہ ذرہ عظمت رفتہ پر اشکبار ہے کیا آواز موجود نہیں؟ افسوس کہ تم نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور دیکھتے ہو تو اس طرح کہ تمہارے لئے یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ تمہاری نیندیں معلوم ہوتا ہے صبح قیامت تک دراز ہوگئی ہیں، کیا میری آواز صدا بصحرا ہے؟ تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ سوتے رہو گے اور قیامت کا سور پھکنے تک اُٹھو گے نہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت تم پر قیامت سے پہلے گزر جائے۔
(ایضاً)

ایمان کی قوت

آسمان کی تمام بجلیاں اُتر آئیں اور ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں لیکن وہ ایک ثانیہ کیلئے بھی ایمان کو شکست نہیں دے سکتی ہیں۔ قدرت کاملہ جب کسی فرد یا جماعت کو ایمان کی طاقت بخشتی ہے، تو وہ بے پناہ ہوجاتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۳)

تمہارے قدموں کا انتظار

میری طرف نہ دیکھو، اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ اس کے چاک گن لو بوقتِ ضرورت یہ نہیں کہ بخیہ کرلو، سنو کہ اسلام اب بھی حجاز کے صحرا میں دیوانگی عشق کو آواز دے رہا ہے اور وہ ایک بیابان جہاں تم نے اپنے قدموں کی چاپ سے لالہ زار پیدا کئے تھے۔ تمہارے قدموں کے انتظار میں ہے۔ اب گریبان کے چاک اپنے قافلہ ایثار اور کاروان

استقامت کا پھریرا بنالو، منزل دوڑ کر تمہارے قدم لے گی۔ (ایضاً)

گوشہ امن و عافیت

آج کرۂ ارضی کی خشکی و تری حق و عدالت سے محروم ہو چکی ہے اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ بندوں کیلئے کوئی گوشہ امن و عافیت باقی نہیں رہا۔ گویا زمین کی پچھلی تمام نامرادیاں لوٹ آئی ہیں اور تاریخ عالم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں، سرزمین اصحاب کہف کا جبر و طغیان، فراعنہ مصر کا جبر و استبداد، نمارودۂ کلدان کا غرور اصحاب مدین کا انکار و اعراض قوم عاد کا فسق و عدوان، یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ (علماء سے خطاب)۔

(ایضاً ص ۲۵۴)

میر کارواں

آج ایک ایسے عازم کی ضرورت ہے، جو وقت اور وقت کے سروسامان کو نہ دیکھے بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار و خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولان قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔ وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبشِ لب پر حرکت کرے۔ اگر انسان اس طرف سے گردن موڑ لیں، تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے تو آسمان کو اپنی رفاقت کیلئے نیچے اتار لے اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو، اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے اسرار و غوامض، معالجہ

اقوام اور طبابت عہد و ایام کے سرائر و قضایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفہ کتاب و سنت ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے وما ذالك على الله بعزيز ۔ (ایضاً ص ۲۵۴)

بے یار و آشنا اور غریب الوطن

میری طرف دیکھو، میں ایک انسان تم میں موجود ہوں، جو سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا، صرف ہی ایک بات کی جانب تڑپ تڑپ کر پکار رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں ۔ تم نے ہمیشہ اعراض کیا، تم نے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں ۔ افسوس تم میں کوئی نہیں، جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو میں سچ مچ کہتا ہوں کہ اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں ۔

جماعتوں کے اعمال

دنیا کے تمام تغیرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی ختم ہو جاتے یا جاری رہتے ہیں ۔ بار بار پیدا نہیں ہوتے ۔ البتہ اُتار چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں ۔ کسی قومی جد و جہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ کل پھر نہیں چڑھے گا ۔

امتحان کی بازی گاہ میں

جماعت یا دوڑتی ہے یا بیٹھ جاتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ

یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ جب بھی آزمائش و ابتلاء کے معرکے پیش آئے ہیں ہمیں قربانی و ایثار کے الاؤ روشن کرنے کیلئے اپنا خون دینا پڑا ہمارے سامنے شہادت کے میدان اَٹ جاتے ہیں۔ لاشوں کے ڈھیر صدا دیتے ہیں طوق و سلاسل کا بازار گرم ہو جاتا ہے، قید خانوں کے پٹ کھل جاتے ہیں اور اسیرانِ جہد حریت کی ڈار لگ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ امتحان کی اس بازی گاہ میں ہمیں بہت کچھ کھونا پڑتا ہے، لیکن جو چیزیں عشق کی راہ میں کھوئی جائیں ان پر معناً افسوس تو ہو سکتا ہے، ہراس نہیں، کیونکہ ہراس یقین و آگہی کی موت ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۴)

الہلال کی دعوت

دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں رہا۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی ہے، میں انیس (۱۹) برس سے کانگرس میں ہوں اس تمام عرصے میں کانگرس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں جس کی ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، حالات میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے میں ان کے اندر کھڑا رہا۔ میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا، میں اپنے مشاہدے کو جھٹلا نہیں سکتا، میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں یا اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دوں ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کیلئے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے، جس کی میں نے ۱۹۱۲ء کے ''الہلال'' میں انہیں دعوت دی تھی۔ (ایضاً ص ۲۵۵)

میرا ورثہ

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں' میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہند کی فیاض گود

ہندوستان کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی ہے اور اس کی فیاض گود نے سب کیلئے جگہ نکالی ہے، انہیں قافلوں میں

آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کیلئے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا اعلان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کے طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا، ہم اپنے ساتھ ایک ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی، ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی سب سے زیادہ قیمتی شے دے دی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔ تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ (ایضاً ص ۲۵۶)

طاقت کے فیصلے

دوسری جنگ عظیم اپنی ہولناک خون خواریوں سمیت یورپ کے میدانوں میں پھیل چکی ہے، ایک پردہ گرتا، دوسرا اٹھتا ہے یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے، کل کیا ہونے والا ہے کہ کل آج کا دن اور آج کی رات گزار کر آئے گا۔ حالت یہ ہے کہ ہفتوں میں صدیاں گزرتی چلی جارہی ہیں۔ آنکھ کی ایک جھپکی میں صورت

حالات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے تصور و گمان سے بعید ہے۔ خدائے علیم و خبیر ہی جانتا ہے کہ آئندہ ساعت اپنے ساتھ کیا لا رہی ہے؟

بلندیاں اُٹھ اُٹھ کر پستیاں بن رہی ہیں اور پستیاں اُبھر اُبھر کر بلند ہو رہی ہیں۔ مسٹر چرچل انگلستان کا وزیر اعظم ہونے کے بجائے کیمرج یا آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوتا تو ہندوستان کے بارے میں اس کا فیصلہ مختلف ہوتا وہ نسل انسانی کے ہمہ گیر تجربوں سے فائدہ اٹھاتا، ضد نہ کرتا، تجزیہ کرتا، لیکن اقتدار نے ان کے ذہن کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اس کا مزاج طاقت کا مزاج ہو گیا ہے اور طاقت ہمیشہ تاریخی سچائیوں کو جھٹلا کر اپنی ذات کے فیصلوں پر بھروسہ کرتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۷)

صبحِ آزادی

ہندوستان اور پاکستان کی صبح آزادی خون میں ڈوب کر طلوع ہوئی۔ ہندو مسلم فسادات برطانوی مشن کے زمانے ہی میں شروع ہو چکے تھے۔ ابھی مشن ہندوستان میں تھا تو اکا دکا قتل ہو رہے تھے مشن رخصت ہو گیا تو نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشر، امرتسر، لاہور راولپنڈی وغیرہ میں نوع انسانی کا لہو ارزاں ہو گیا، بستیوں کی بستیاں صرف اختلاف مذہب کے جرم میں تاراج کی گئیں، عورتیں اغوا ہو گئیں، جوان قتل کر دیئے گئے، بچوں کر مار دیا گیا بوڑھوں کو موت چاٹ گئی۔ بربادی اتنی بڑی تھی کہ انسان وحشی ہو چکا تھا۔ پھر

جب آزادی کا دن آیا تو دونوں طرف قتل عام تھا، دھلی جو کبھی مسلمانوں کا شہر تھا اور جہاں ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے دن بھی مسلمانوں کی تاریخ چپے چپے میں بکھری ہوئی تھی، مسلمانوں کیلئے آغوش قبر کی طرح تنگ ہوگیا اور جو بازار کبھی ان کی چہل پہل سے پُر رونق تھے، ان کیلئے چتا ہوگئے۔ مولانا نے ان دنوں دھلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک فقید المثال لیکن مجروح و مضطرب اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ایک دل گداز تقریر کی، اس تقریر کے چند اقتباس حسب ذیل ہیں۔ (ایضاً ص ۲۵۶)

لیل ونہار کی گردشیں

''عزیزان ملت ایک زمانے میں کہ اس پر لیل ونہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں۔ میں نے تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا، لیکن اس وقت تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد تھا۔ لیکن آج تمہارے چہروں کی پریشانی اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار سالہا سال پہلے کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان قطع کرلی، میں نے قلم اٹھایا، تم نے میرے ہاتھ قلم کردیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں توڑ ڈالے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی، تم نے غفلت وانکار کی وہ ساری سنتیں تازہ کردیں جو روبہ انحطاط قوموں کا مقدر ہوتی ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان تمام خطروں نے تمہیں گھیر

لیا ہے، جن کا خوف تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا۔
(ایضاً ص ۲۵۷)

دعوتِ عزم و ہمت

اب میں ایک جمود ہوں یا دور افتادہ صدا، میں نے وطن ہی میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے، وہ خوف جو تمہارے حواس کو محیط ہے تم نے خود کو فراہم کیا ہے۔ یاد رکھو! اس قسم کے خوف قوموں کی حیات معنوی کیلئے مرض الوفات ہوتے ہیں۔

تذبذب کا راستہ چھوڑ دو

جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا، وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے اور شاید اس لئے کہ تمہارے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔ انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے خلاف الٹ گئی اور راہنمائی کے وہ بت جو تم نے خود تراشے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ میں اس کہانی کے اوراق کو اُلٹ کر تمہارے حواس کو نہ تو معطل کرنا چاہتا ہوں اور نہ مجھے ہراس کا تذکرہ چھیڑ کر تمہارے وجود کو شل کرنا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ لیکن وقت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے سامنے سپر انداز ہو، میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی ترک کردو۔ وہ

دیکھو جامع مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی عظیم الشان تاریخ کے پُر رونق صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کناروں پر تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج یہاں رہتے ہوئے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے کیا بھول گئے ہو کہ دلی تمہارے ہی خون سے سینچی ہوئی ہے (ایضاً ص ۲۵۸)

اشتعال اور بزدلی

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو، جس طرح کچھ دن پہلے تمہارا جوش و خروش غلط تھا، اسی طرح آج تمہارا خوف و ہراس بے جا ہے۔ مسلمان اور اشتعال یا مسلمان اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ وہ لوگ جو تمہیں چھوڑ کر چلے گئے، انہوں نے تمہیں فرار ہونے ہی کیلئے اکٹھا کیا تھا۔ اگر تمہارے دل ان کے ساتھ رخصت نہیں ہو گئے اور بدستور پہلو میں ہیں، تو ان کو اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمی ﷺ کی معرفت فرمایا تھا۔ ''انّ الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔ (جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کیلئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم)۔ (ایضاً ص ۲۵۸)

تاریخ کا ساتھ دو

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کیلئے تیار نہ تھے۔ میں نے پینتیس برس پہلے ۱۹۱۲ء میں ببانگ دہل کہا تھا کہ

ہندوستان کی آزادی رُک نہیں سکتی، برطانوی اقتدار کو رخت سفر باندھ کے جانا ہوگا۔ ہمارے دماغوں میں غیر ملکی غلامی کے خاتمے سے متعلق کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں نے پس وپیش کیا تو یہ گویا تاریخ میں ان کی بدبختی کا باب ہوگا۔ تب انہیں ہندوستان پر اپنا حق جتاتے ہوئے ظاہر میں نہ سہی، باطن میں ضرور خلش ہوگی۔ افسوس وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

اب پھر کہتا ہوں تاریخ کا ساتھ دو۔ ستارے ٹوٹ گئے، تو کیا ہوا، رات تو چلی گئی سورج چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان تاریک راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۹)

یہ ایمان کی جان کنی کیوں؟

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیروں سے کانپتے ہو یاد کرو کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا، گھٹاؤں کا طوفان کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں، وہ آخر تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں لپکیں تو ان پر مسکرائے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اُٹھی تو رخ پھیر لیا آندھیاں آئیں تو ان سے کہا لوٹ جاؤ۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے

ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان نہ تھا۔ (ایضاً)

لکھنے پڑھنے کی آزادی

لیکن ۸۔ جولائی ۱۹۱۷ء کو یکا یک حکومتِ ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کر دیے اور اس طرح اُس امید کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ نظر بندی کے بعد کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔

اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا یعنی تصنیف وتسوید کا مشغلہ۔ نظر بندی کی اُنیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا، اگر زندگی کے تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں، تو زندگی کی راحتوں میں کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس صورتِ حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا، اس گوشہ میں بھی مجھے محرومی ہی سے دوچار ہونا تھا۔

(تفسیر ترجمان القرآن ص ۴ : از مولانا آزادؒ)

زندگی کی سب سے بڑی آزمائش

۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو بعض دیگر رفقاء بنگال کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ میری گرفتاری پریس کے انتظامات میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی اور میں نے اس کا پورا

انتظام کرلیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں بھی کام بدستور جاری رہے۔ لیکن گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ اس افسانہ کی آخری الماناکی ہے۔ اس وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رُک گئی، بلکہ میری عملی زندگی کے ولولے افسردہ ہو گئے

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ میرے خلاف مقدمہ چلانے کیلئے کافی مواد موجود نہیں ہے، تو اُسے مواد کی جستجو ہوئی اور اس لئے تیسری مرتبہ میرے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کیلئے جو لوگ آئے تھے، اُن میں کوئی شخص ایسا نہ تھا، جو اردو یا عربی و فارسی کی استعداد رکھتا ہو۔ جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ہوئی ملی انہوں نے خیال کیا اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسودات کا تمام ذخیرہ اُٹھا لے گئے، حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں۔

سوءِ اتفاق سے اُس وقت کسی شخص نے مطالبہ نہیں کیا کہ کاغذات مرتب کر کے لیے جائیں اور حسب قاعدہ اُن پر گواہوں کے دستخط ہو جائیں۔ نیز اُن کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے دی جائے۔ افسرانِ تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے۔ صرف یہ لکھ کر متفرق قلمی کاغذات لیے گئے، چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہو گئے۔ پندرہ ماہ کے بعد جب میں رہا ہوا، تو حکومت سے کاغذات کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصہ کی خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے، مگر اس حالت میں ملے کہ تمام ذخیرہ برباد ہو چکا تھا

افسرانِ تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا ہے، تو قلمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے اور الگ الگ پٹھوں کی دفتروں میں ترتیب دیے ہوئے تھے۔ ان میں مختلف مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا، لیکن جب واپس ملے، تو محض اوراقِ پریشان کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔

یہ میرے صبر و شکر کیلئے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اُتروں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا، جو جامِ حوادث نے میرے لبوں سے لگایا لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

(ایضاً ص ۶)

سیاسی شورشیں اور علمی جمعیتیں

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بیک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ زمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں عُرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے۔

زاں شکستم کہ بہ دُنبالِ دلِ خویش مدام
در نشیبِ شکنِ زلفِ پریشان رفتم

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سرِ نو محنت کی جائے لیکن اس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہوگئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثے کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔

طبیعت کی بڑی رُکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی، یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہل قلم کے لئے اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں۔ وہ ہزاروں صفحے نئے آسانی لکھ دے گا، لیکن ایک ضائع شدہ صفحے کے دوبارہ لکھنے میں اپنی طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا۔ فکر و طبیعت کی جو گرم جوشی پچھلی محنتوں کی بربادی سے بجھ جاتی ہے، بہت دشوار ہوتا ہے کہ اُسے دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو ایسی بدقسمتیوں سے دوچار ہوئے ہوں۔ میں نے ''ٹامس کارلائل'' کے حالات میں جب پڑھا تھا کہ اس نے انقلاب فرانس پر اپنی مشہور کتاب دوبارہ تصنیف کی اور اہل فن نے اسے قوتِ تصنیف کا یک غیر معمولی مظاہرہ سمجھا، تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے؟ لیکن اس حادثے کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ صرف غیر معمولی ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے اور فی الحقیقت کارلائل کی منصفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ (ایضاً ص ۷)

بوئے گل، نالۂ دل

معروف دانشور مصنف و ادیب شورش کاشمیری مرحوم میرے محبوب اور پسندیدہ مصنف ہیں، ابتداء شعور ہی سے ان کی تحریروں کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں سکول کا طالب تھا کہ ان کے ہفت روزہ چٹان سے فکر و ذہن نے ادبی، علمی اور مطالعاتی بالیدگی حاصل کی۔ جب شعور میں پختگی آئی، تو ان کی مشہور کتابیں بالخصوص سوانحی ذخیرہ پڑھ ڈالا۔ ''سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ'' کو حرزِ جان بنایا، ''بوئے گل نالہ دل دودِ چراغ محفل'' اگر دعوے سے کہوں کہ بیس سے زائد مرتبہ پڑھی ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ''شب جائے کہ من بودم'' اور ''پسِ دیوارِ زنداں'' مطالعہ میں آئیں ''اس بازار میں'' نے انسانی خونخواری و بہیمت، درندگی اور بے رحمی و کمینگی کے بھیانک مناظر دکھائے۔ ''موت سے واپسی'' نے حوصلہ ہمت جرأت و بہادری اور استقامت کے سنگِ میل اور نشانِ راہ کھڑے کر دیے، سب سے آخر میں ''مولانا ابوالکلام آزادؒ'' (سیرت و افکار) مطالعہ میں آئی۔ اس نے دل لوٹ لیا اور فکر ذہن، عزم و ہمت اور ارادہ و عمل کے سوئے ہوئے جذبات کو اُبھار دیا، پڑھا، بار بار پڑھا اور اب پھر پڑھنے کے اشتیاق میں بے قرار ہوں۔

دورانِ مطالعہ بہت سی چیزیں محفوظ کیں اور اپنی مطالعاتی ڈائری ''جگر لخت لخت'' کے صفحات کی زینت بنائیں، اب جب کہ قارئین کو بھی ساتھ لیکر چلنا ہے، تو اسی سے بعض لعل وجواہر کا انتخاب کر کے ''سراغِ زندگی'' کا حصہ بنایا جارہا ہے اس باب کا عنوان بھی شورش مرحوم کی کتاب سے مستعار ہے۔ پڑھتے جایئے، عزم وہمت اور اخلاص عمل کا بھرپور استفادہ کر کے عزیمت اور استقامت کی راہ چلتے جایئے۔ خدا تعالیٰ سب کا حامی وناصر ہو۔ (عبدالقیوم حقانی)

استاد کی نگاہ اور دعا

معروف دانشور شورش کاشمیری رقمطراز ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ استادوں کی نگاہ اور دعا دونوں اثر کرتی ہیں دھرم رتن سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے، سندھی نژاد، انتہائی خلیق نیک دل شریف اور وضعدار، ان کی بیوی نہایت خوبصورت اور کچھ زیادہ عمر کی نہ تھیں، کالج میں پڑھتی تھیں، ہم لوگ گھر لوٹتے، تو کالج سے واپس آرہی ہوتیں، راستہ میں آمنا سامنا ہوتا ''بھلے مانس حیا کرو'' ماسٹر دھرم رتن کا تکیہ کلام تھا۔ وہ طلبہ کو بدنی سزا دینے کے خلاف تھے۔ بڑے سے بڑے قصور پر ڈانٹ ڈپٹ کر کے چپ ہو جاتے۔ ہماری جماعت کے تین طلبہ بے قابو تھے۔ ان تینوں نے ان کی اہلیہ کو چھیڑنا شروع کیا، وہ گزر رہی ہوتی، تو ''بھلے مانس حیاء کرو'' کا آوازہ کستے، قہقہے لگاتے اور وہ کنی کترا کر نکل جاتیں آخر ایک دن خاوند سے شکایت کی، ماسٹر صاحب نے اگلے روز مولوی نیاز محمد کو علیحدہ بلوا کر سارا قصہ بیان کیا۔ وہ چاہتے تو ان طلبہ

کو سکول سے خارج کر سکتے تھے، لیکن ان کی شرافت نے عفو سے کام لیا اور ان کے نزدیک یہ علاج بھی نہ تھا، مولوی صاحب نے ان تینوں کو بلا کر دوستانہ انداز میں سمجھایا اور یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس سے کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ بظاہر تو ان تینوں نے آئندہ باز رہنے کا وعدہ کر لیا، لیکن ہفتہ بعد پھر وہی مصرع طرح اور اس پر گرہ لگنے لگی۔ جب پانی سر سے گزر گیا، تو ماسٹر دھرم رتن نے بھری جماعت میں ڈانٹا، لیکن ان کے چہ نچلوں کا ترشح جاری رہا۔ ماسٹر دھرم رتن کا جی کھٹا ہو گیا، تو تینوں کو اکھٹا کیا اور طلبہ کے روبرو کہا کہ جس نے استاد کی عزت پر ہاتھ ڈالا، وہ ہمیشہ بدقسمت رہا۔ یاد رکھو ایم اے بھی کر لو گے تو عزت و توقیر کبھی حاصل نہ ہو گی، استاد کی بددعا خالی نہیں جاتی ان تینوں میں سے ایک نے ایم اے کیا، خواری رہی، تمام گھناؤنی عادتیں اس میں سرائیت کی ہوئی ہیں۔ دوسرا نوجوان جو ایک انسپکٹر پولیس کا لڑکا تھا، اس حالت کو پہنچا کہ چانڈو خانوں میں اس کی زندگی گزر رہی ہے، کبھی صاحبِ جائداد تھا، آج ٹکے ٹکے کا محتاج ہے۔ آوارگی میں بھی پیش پیش تھا، تیسرا نوجوان بی اے کرنے کے بعد کٹا ہوا پتنگ ہو گیا آج تک سکون سے محروم ہے۔

(بوئے گل نالہ دل، دودِ چراغ محفل ص ۱۷ از شورش کاشمیری)

افلاس کا عالم

لیکن مشق کا ایک دور تھا، جس کو افلاس جھنجوڑتا اور عسرت

لوریاں دیتی رہی، ان دنوں ایک تجربہ ضرور ہوا کہ ان حالات میں اعزہ بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، افلاس کو رُسوا کرنے سے بہتر ہے کہ چھپایا جائے کیونکہ ان حالات میں رُستگاری تو شاذ ہی ہوتی ہے، لیکن عام دوستوں کے لہجے سے احترام اُڑ جاتا ہے۔

(ایضاً ص ۶۲)

دوستوں کا رنج

غرض ہفتہ بھر بمبئی کی سیاحت و سیاست میں گزار کر ہم لوگ پلٹے اس دوران انسانی کمزوریوں کا اندازہ کیا، اپنے احوال پر نظر ڈالی، ایک چیز جس نے میرے دماغ پر عجیب اثر ڈالا، انسانی فطرت کا ایک خاص رویہ تھا کہ اپنے کسی ہم سفر کی پذیرائی پر حاسدوں سے زیادہ دوستوں کو رنج پہنچتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

سفر اور قید' دو پیمانے

انسانی فطرت کے غوامض و اسرار سے آگاہی کے لئے جیل خانہ بہترین جگہ ہے، ہر شخص بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے انفرادی سیرت اور اجتماعی ذہنیت کی پہچان کے لئے اس سے بڑی کوئی جگہ نہیں، کھرا اور کھوٹا دونوں نکھر جاتے ہیں، سفر اور قید دو پیمانے ہیں، جن سے رفیقوں کے ظرف کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(ایضاً ص ۲۴۰)

محمد علی جناح اور علماء

مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا:

''کہ مسٹر جناح علماء کو ساتھ ملانے یا انہیں کوئی پوزیشن دینے کیلئے تیار نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ لیگ کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں آج حالات نے انہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ غیر مشروط متابعت کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ وہ علماء کے انسٹی ٹیوشن ہی کے قائل نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ناگپور کانگرس میں تقریر کے دوران انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کو ''مسٹر'' کہا تو لوگوں نے ''مولانا'' پر زور دیا، انہوں نے دوبارہ ''مسٹر'' کہا تو لوگوں نے پھر اصرار کیا اب لوگ کہہ رہے ہیں ''مولانا'' محمد علی جوہر اور جناح کہہ رہے ہیں، ''مسٹر'' محمد علی چاروں طرف غل مچ گیا آخر اسی فضا میں جناح بیٹھ گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں آخری وقت تک کھچاؤ رہا۔ مسٹر جناح اپنی تعلیم اور اپنے مسلک کے اعتبار سے بھی علماء کو پسند نہیں کرتے۔ اپنی سیاست کے زور پر انہوں نے علماء کی دینی وجاہت کو ختم کر دیا اور عوام الناس کے دلوں سے علماء کا احترام اٹھا دیا ..... اور یہ موجودہ سیاست کا منطقی نتیجہ ہے۔

(ایضاً ص ۳۹۹)

مولانا مدنیؒ قرن اولیٰ کی حیاء

مولانا حسین احمد مدنیؒ کو دیکھا ضرور، نیاز بھی حاصل کیا، ان کی صحبت میں آدھ پون گھنٹہ بیٹھا بھی، لیکن شرف مکالمت سے محروم

رہا، ان کے اِجلال واحترام کا یہ حال تھا کہ علماء مؤدب ہوکر بیٹھتے تھے۔

جن علماءِ حق کا تذکرہ کتابوں میں دیکھا ہے وہ ان کی ہُو بہُو تصویر تھے، فقر واستغناء کا مجسمہ، علم ونظر کا پیکر، حدیث وفقہ کا گنجینہ غیرت وحمیت کا پُتلا، ایثار واستقامت میں ڈھلا ہوا وجود۔ مجال ہے زبان پر کسی کے خلاف کلمہ استخفاف ہو، ایک ایسا انسان جس کا ذہن کسی کی اہانت یا کسی کی توہین کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا، روضۂ رسولؐ کی جاروب کشی نے ان کی آنکھوں میں قرنِ اوّل کی حیاء بھردی تھی۔ (ایضاً ص ۴۰۰)

اسلام کی طرف واپسی

اسلامیات سے مجھے غایت درجہ شغف تھا، مولانا محمد گل شیرؒ سے قرآن مجید اور ترجمہ پڑھا، لیکن اسلامیات کے دوسرے مضامین بالخصوص سیرت اور تاریخ خود مطالعہ کرتا رہا، اردو اور فارسی کی بے شمار کتابیں پڑھیں، مارکسزم نے میرے دماغ کو ہلا ڈلا۔ اس کی منطق کے سامنے فکر ونظر سپر انداز ہوگئے۔ یہاں تک کہ میں خدا کی نفی پر کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا ہمنوا ہوگیا، لیکن سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی ﷺ پر ایک چھوٹی سی کتاب ''خطبات مدارس'' مجھے دوبارہ مسلمان بنانے کا باعث ہوگئی۔ اس کتاب کے مطالعہ ہی سے میں نے یہ نکتہ اخذ کیا کہ دنیا کو اتنا نظریوں نے نہیں جتنا شخصیتوں نے بدلہ ہے، اصل چیزیں کتابیں نہیں انسان ہیں، یہ

الگ بات ہے کہ انسان کتاب پر ایمان لاتے ہیں انسان پر نہیں حالانکہ کتابیں بھی انسانوں ہی پر نازل ہوئی ہیں یا کتابوں کے مصنف بھی انسان ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے افضل و اکمل کوئی سیرت نہیں، وہی ایک انسان تھے جن کی سیرت نے لاکھوں انسان پیدا کئے اور ان کا فیضان آج تک جاری ہے۔ یہی انسان زندگی کے ہر شعبہ اور ہر دور میں انسانوں کے رہبر رہے، یہ دوسری بات ہے کہ اسلام سیاسی طور پر ایک بڑی طاقت نہیں رہا اور اس کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو اسلام کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن خود اسلام کیلئے استعمال نہیں ہوئے۔

اسلام میں واپسی کے بعد جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ گرویدہ کیا اور میں دماغاً پکا مسلمان ہوگیا، وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ترجمان القرآن تھا، ترجمان القرآن نے مجھے ''خدا موجود ہے'' کے آستانہ پر جھکا دیا، مولانا کا عدالتی بیان تو میں بہت پہلے پڑھ چکا تھا اور اس نے ابتلاء میں میری سیرت کو چمکا دیا تھا، لیکن ''الہلال'' کے مطالعہ نے جس کی فائلیں مجھے دستیاب ہوگئی تھیں میرے ذوق وشوق اور میرے کردار و سیرت کو استقامت و قربانی میں پختہ کر دیا، علامہ اقبال کے کلام نے مجھ میں اسلام کے لئے عصبیت پیدا کی اور میں محسوس کرنے لگا کہ اسلام فی الواقعہ ایک عصری طاقت ہے، جس سے مسلمان معاشرے نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (ایضاً ص ۲۳۶)

جدوجہد میں!

خواہش بہترین نتائج کی کرو
امید کمترین نتائج کی کرو
اور تیار بدترین نتائج کیلئے رہو
(اقبال) (ایضاً ص ۸)

یونان کا نامور فلسفی

''یونان کا نامور فلسفی جب عوام کی ناقدری سے عاجز آ گیا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے فکر و نظر اور علم و حکمت پر لوگ توجہ نہیں دیتے بلکہ مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر پتھراؤ کرتے ہیں، تو اس نے دشنام و اتہام سے تنگ آ کر رقص و سرود کا ایک طائفہ بنایا، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر ڈھول گلے میں ڈالا، چہرہ پر بھبھوت مل لی، ہاتھوں میں کنگن ڈال لئے، گانے بجانے کا سوانگ رچایا اور پاگلوں کی طرح بازاروں میں ناچنے لگا، وہ رقص و غنا کے ابجد سے بھی واقف نہ تھا لیکن رسمی دانشوروں نے سر پر اٹھالیا، اس کے رقص پر محاکمہ ہونے لگا کہ اس فن میں اس نے نئی راہیں نکالی ہیں، تب پاگل تھا اب مجتہد ہے۔

جب یونان میں اس کے اس نئے روپ کا شہرہ عام ہو گیا، تو اس نے اعلان کیا کہ فلاں دن وہ اوپن ائیر تھیٹر میں اپنے طائفہ سمیت رقص و سرود کے نئے انداز پیش کرے گا۔ تمام ایتھنز ٹوٹ پڑا، اس نے رقص کا نیا انداز پیش کیا، سرتاپا دیوانا ہو گیا، ناچ نہیں جانتا تھا لیکن پاگلوں کی طرح ناچتا رہا، عوام و خاص اور امرا و شرفا لوٹ پوٹ گئے، جب وہ تھک

گیا اور محسوس کیا کہ جو لوگ اس کے سامنے بیٹھے ہیں اس کی مٹھی میں ہیں تو یکا یک سنجیدہ ہو کر کہا:

''یونان کے بیٹو! میں تمہارے سامنے علم و دانائی کی باتیں کرتا رہا میں نے تمہاری برتری کیلئے فکر و نظر کے موتی بکھیرے، تم نے میری باتیں سننے سے انکار کر دیا، میرا مذاق اُڑایا، مجھے گالیوں سے نوازا، پتھراؤ کیا اور خوش ہوتے رہے، تم نے حق اور صداقت کی ہر بات سننے سے انکار کیا مجھے پاگل قرار دے کر خود پاگلوں کی سی حرکتیں کرتے رہے، تم نے اپنے دماغ حکمرانوں کے پاس رہن رکھ دیئے، تمہاری جسموں کی طرح تمہاری عقلیں بھی امراء و حکام کی جاگیر ہو گئی ہیں۔

میں عاجز آ گیا، تو میں نے یہ روپ اختیار کیا، میں فلسفی کی جگہ بھانڈ ہو گیا، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ناچ کیا ہوتا ہے اور گانے کسے کہتے ہیں لیکن تم نے میرے اس بھانڈ پر تحسین و ستائش کے ڈونگرے برسائے۔ پہلے تم میں چار آدمی بھی میرے پاس جمع نہیں ہوتے تھے آج انسانوں کا جم غفیر میرے سامنے بیٹھا ہے گویا تم نے مٹ جانے والی قوم اور ایک فنا ہو جانے والے معاشرے کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں، تم ایک انحطاط پذیر ملک کی علیل روحوں کا انبوہ ہو۔

تم پر خدا کی پھٹکار ہو، تم نے دانائی کو ٹھکرایا اور رسوائی پسند کی۔

تم خدا کے غضب سے کیونکر بچ سکتے ہو کہ تمہارے نزدیک علم ذلیل ہو گیا ہے اور عیش شرف و آبرو۔ جاؤ، میں تم پر تھوکتا ہوں میں پہلے بھی پاگل تھا آج بھی پاگل ہوں۔

جب علم ونظر اور فکر ومعروف کو یہ مرحلہ جانکنی پیش آ جائے، خوشامد کا بول بالا ہو اور حکمت و دانائی احمقوں کے گھرانے میں چلی جائے اور اپنے دماغ کی علالت کو صحت کا نام دینے لگیں۔ علم کے مالک جاہل ادب کے اجارہ دار گاؤدی، سیاست کے متولی کاسہ لیس اور دین کے مسند نشین بکاؤ ہو جائیں، تو اس فضا میں یونان کے فلسفی کی طرح پاگل ہو کر ناچنا بھی عین عبادت ہے اور نہیں تو اس سے خدا کا غضب ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ (موت سے واپسی ص ۴۱ از شورش کاشمیری)

بوستانِ علم و عمل

احقر کے دورۂ حدیث کا سال تھا، استاذی و استاذ العلماء محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق" قدس سرہ العزیز ضعف، علالت کمزوری اور ہجوم عوارض و امراض کے باوصف ہم لوگوں کی درخواست پر ترمذی کتاب المغازی پڑھا رہے تھے۔

دوپہر کو مخدوم و مکرم حضرت مولانا انوار الحق مدظلہ کے کوارٹر میں قیام ہوتا، میں ساتھ رہتا، ترمذی منگوا لیتے، مجھ سے متن اور حواشی پڑھواتے۔ ایک روز ارشاد فرمایا بیٹے! شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی "بستان المحدثین" لے آؤ، لایا تو مجھ سے اس کے متعدد مقامات پڑھوائے، خود سنتے رہے۔ فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا، وقت ملے تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کر لیجئے، پھر فرمایا، وقت نکالیے اور کم از کم حضرت امام مالکؒ کا تذکرہ ضرور پڑھ لیجئے۔

حضرتؒ کا ارشاد فرمانا تھا کہ بے چین طبیعت مضطرب ہوگئی۔ خود اپنی گرہ سے پیسے لگا کر بازار سے اپنا نسخہ خریدا اور اسی روز ظہر کے بعد سے مطالعہ شروع کیا۔ دوسرے روز دوپہر کو جب حضرتؒ کی خدمت میں

ترمذی کا متن وحاشیہ پڑھنے کا وقت آیا، تو عبارت پڑھنے سے پہلے پہلے حضرتؒ نے از خود دریافت فرمایا، بیٹے! بستان المحدثین میں امام مالکؒ کا تذکرہ پڑھا؟ احقر نے عرض کیا حضرت! ساری کتاب پڑھ ڈالی، ارشاد فرمایا بیٹے! دوبارہ پڑھو، سہ بارہ پڑھو اور بار بار پڑھتے رہو، جو باتیں دل کو بھائیں، پسند آئیں، علم وعمل کی انگیخت کا ذریعہ بنیں، انہیں علیحدہ لکھ لو اور پھر بوقت فرصت انہیں بار بار پڑھا کرو، فائدہ ہوگا، علمی نفع بھی ہوگا اور عملی نفع بھی۔ احقر نے تعمیل ارشاد کو سعادت سمجھا، بستان المحدثین کے پسندیدہ اقتباسات میری ''جگرِ لخت لخت'' میں لختِ جگر بن گئے۔

یہ زمانہ احقر کی طالب علمی کا تھا، نقل اور اخذ و انتخاب بھی اسی زمانے کا ہے۔ دورۂ حدیث کے ایک طالب علم کی فکری، علمی اور ذہنی سطح کیا ہوگی اور اس کے علم ومطالعہ کی پرواز کا کیا معیار ہوگا... قارئین اس سے صرف نظر فرمائیں، تاہم جو کچھ بھی منقول ہے وہ ناقل کی نہیں محدث کبیر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تحریریں ہیں۔ ذیل میں وہی شہ پارے نذر قارئین ہیں، یقیناً ''سراغِ زندگی'' پانے کا مؤثر ذریعہ بنیں گی۔ (عبدالقیوم حقانی)

امام مالکؒ ، موت کے دروازے پر

یحییٰ بن یحییٰؒ بیان کرتے ہیں کہ جب امام مالکؒ کا مرض الموت طویل ہوا اور وقت آخر آپہنچا، تو مدینہ اور دیگر شہروں کے تمام فقہاء وعلماء امام صاحبؒ کے مکانِ فیض نشان میں اس غرض سے جمع ہوئے کہ امام صاحبؒ کی آخری ملاقات سے فیضیاب اور اس پیشوا مخلوق کی وصیتوں

سے بہرہ یاب ہوں۔ میں نے ان کو شمار کیا، تو ایک سو تیس علماء وفقہاء موجود تھے۔ میں بھی ان میں تھا۔ میں امام کے پاس جاتا تھا، سلام کرتا تھا اور سامنے کھڑا ہوتا تھا کہ شاید اس آخری وقت میں امام صاحبؒ کی کوئی نظر مجھ پر پڑ جائے اور آخرت و دنیا کی بہبودی حاصل ہو جائے۔ اسی حالت میں تھا کہ امام نے آنکھیں کھولیں اور ہماری طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا:

''جس اللہ نے ہمیں خوشی وغمی دکھلا کر کبھی ہنسایا، کبھی رُلایا، اس کا شکر ہے، اسی کے حکم سے زندہ رہے اور اسی کے حکم پر جان دیتے ہیں''۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

''موت آ گئی ہے خدا تعالیٰ سے ملاقات کا وقت قریب ہے۔ سب نے آپ سے قریب ہو کر یہ عرض کیا کہ اے ابو عبداللہ! اس وقت آپ کے باطن کا کیا حال ہے؟ فرمایا نہایت خوش ہوں صحبتِ اولیاء اللہ کی وجہ سے، اور میں اہل علم کو اولیاء سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد علماء سے زیادہ کوئی شئے عزیز نہیں ہے۔ نیز میں مسرور اور خوش دل ہوں کیوں کہ میری تمام عمر علم کی طلب اور اس کی تعلیم میں بسر ہوئی اور اپنی سعی کو مشکور خیال کرتا ہوں اس لئے کہ جو عمل حق تعالیٰ نے ہم پر فرض کئے یا اس کے پیغمبر نے مسنون فرمائے وہ سب ہم کو پیغمبر کی زبان سے پہنچے اور آپ کے ارشاد سے ان کا ثواب معلوم ہوا، مثلاً حضور سرور کائنات ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز کی محافظت کرے اس کو ایسا

ایسا ثواب ملے گا اور جو کوئی خانہ کعبہ کا حج کرے گا اس کا یہ ثواب ہے اور جو کوئی شخص کفار کے ساتھ جہاد کرے اس کا خدا کے نزدیک یہ رتبہ ہے اور ان معلومات کو علم حدیث کے طالب علم کے سوا اور کوئی شخص تفصیل اور صحت کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتا۔ پس یہ علم گویا نبوّت کی میراث ہے کیونکہ ادبیات وعقلیات وریاضیات اور ایسے ہی دوسرے علم کو بغیر طریقہ نبوّت کے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، بخلاف علم ثواب وعقاب اور علم شرائع وادیان کے کیونکہ بغیر چراغ دانِ نبوّت کے ان کے انوار کو حاصل کرنا محال ہے۔ پس جو شخص اس علم کی طلب میں پڑ گیا اور اسی شوق میں گرفتار رہا، عجب کرامت اور ثواب دیکھتا ہے جو انبیاء کی کرامت اور ثواب کے مشابہ ہے اور جس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے''۔

(بستان المحدثین ص ۳۶)

امام مالکؒ کا آخری کلام

اس کے بعد فرمایا کہ

۱ ..... ''میں تم کو ربیعہؒ کی وہ حدیث سناتا ہوں، جو اس وقت تک روایت نہیں کی۔ میں نے سنا ہے کہ وہ خدائے بزرگ وبرتر کی قسم کھا کر کہتے تھے اگر کوئی شخص اپنی نماز میں خطا کرے اور وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ کس طرح نماز ادا کرنی چاہیئے اور یہ شخص اس مسئلہ کو مجھ سے دریافت کرے اور میں اس کو نماز کے فرائض اور سنتوں اور آداب بتلادوں اور اس کے طریقہ ثواب کو بیان کروں، تو میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ

کوئی شخص مجھ کو تمام دنیا کی دولت دے اور میں اسے خدا کے راستہ میں صرف کر دوں۔

۲ ..... خدائے بزرگ و برتر کی قسم! اگر مجھ کو کسی علمی مسئلہ یا روایاتِ حدیث میں سے کسی روایت میں کوئی شبہ پیش آئے اور میں اس کی دھن و تلاش میں اپنے قلب کو ایسا مصروف کروں کہ بیداری و خواب کی حالت میں اس طرح گزار دوں کہ نہ دن کو چین ملے، نہ رات کو بستر پر آرام معلوم ہو اور تمام شب اس شبہ کے باعث میرا دل مکدر رہے اور پھر صبح کے وقت کسی عالم کے پاس جا کر اسے حل کر کے اطمینان حاصل کروں، تو میرے نزدیک ایک سو حج مقبول سے بہتر ہے اور یہ بھی فرمایا کہ:

۳ ..... ابن شہاب یعنی زہری سے میں نے بارہا سنا ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم! اگر کوئی شخص اپنے دینی معاملات میں سے کسی معاملہ میں مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس میں تامل و تفکر کے بعد جیسا کہ مشیر کے ذمہ ہے، بہتر رائے قائم کر کے اس کو راہ حق بتلا دوں کہ اس کے دین کی اصلاح ہو جائے اور اس شخص کو اس رابطہ و تعلق میں جو اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کوئی خلل پیش نہ آئے، تو میرے نزدیک یہ ایک سو غزوہ سے بہتر ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ یہ سب سے آخری کلام ہے جو میں نے حضرت امام سے سنا ہے۔" (بستان المحدثین ص ۳۹)

امام مالکؒ اور تعظیم حدیث

عبداللہ بن المبارکؒ جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور حدیث، فقہ تفسیر اور قرأت کے بڑے امام ہیں اور علماء کے طبقہ میں ایسے مشہور ہیں

کہ ان کی شہرت تعریف اور توصیف سے بالکل مستغنی کرتی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ روایت حدیث فرما رہے تھے۔ ایک بچھو نے نیش زنی شروع کی، تو شاید دس مرتبہ آپ کو کاٹا، اس کی تکلیف کے سبب امام صاحبؒ کا چہرہ کچھ متغیر ہوکر مائل بہ زردی ہو جاتا تھا۔ مگر امام صاحبؒ نے درسِ حدیث کو قطع نہیں فرمایا اور نہ کچھ لغزش آپؒ کے کلام میں ظاہر ہوئی۔ جب مجلس حدیث ختم ہوئی اور سب آدمی چلے گئے، تو میں نے آپؒ سے عرض کیا کہ آج آپؒ کے چہرہ پر کچھ تغیر محسوس ہوتا تھا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا بیشک تمہارا خیال صحیح ہے اور پھر تمام واقعہ ان سے بیان کر کے فرمایا کہ میرا اس قدر صبر کرنا، اپنی طاقت و شکیبائی کی بناء پر نہ تھا بلکہ پیغمبر ﷺ کی حدیث کی تعظیم کی وجہ سے تھا۔ (ایضاً ص ۲۰)

درسگاہ مالکؒ کی عظمت وجلال

سفیان ثوریؒ جن کی شہرت، تعریف و توصیف سے اُن کو مستغنی کرتی ہے۔ ایک روز امام مالکؒ کی مجلس میں تشریف لائے، تو مجلس کی عظمت و جلال اور اس شان و شوکت کے ساتھ انوار کی کثرت اور برکتوں کو دیکھ کر امام مالکؒ کی مدح میں یہ قطعہ نظم فرمایا۔

یَابی الجَوَابَ فَلَا یُرَاجِعُ ھِیبَۃً
وَالسَّائِلُونَ نَوَاکِسُ الاَذقَانِ
اَدَبُ الوَقَارِ وَ عِزُّ سُلطَانِ التُّقیٰ
فَھُوَ المَطَاعُ وَلَیسَ ذَا سُلطَانِ

(اگر امام مالکؒ) جواب دینا چھوڑ دیں تو سب سائل اپنا سر نیچا کئے بیٹھے رہیں اور آپؒ کی ہیبت سے دوبارہ نہ پوچھ سکیں۔

وقار آپ کا ادب کرتا تھا اور آپؒ پرہیزگاری کی بادشاہت پر عزت کے ساتھ متمکن تھے، (عجیب بات یہ تھی) کہ آپؒ کی اطاعت کی جاتی تھی حالانکہ آپؒ بادشاہ نہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۰)

امام مالکؒ کا پسندیدہ شعر

امام مالک صاحبؒ اکثر اس شعر کو پڑھا کرتے تھے۔

وَخَيْرُ أُمُورِ الدِّينِ مَاكَانَ سُنَّةً
وَشَرُّ الْأُمُورِ الْمُحْدَثَاتُ الْبَدَائِعُ.

''دین کا بہتر کام وہ ہے جو طریقہ رسولؐ کے مطابق ہو اور بدترین کام وہ ہیں، جو سنت کے خلاف نئی نئی بدعتیں اپنی طرف سے تراش لی ہوں۔''

یہ شعر حکمت سے پُر ہے کیوں کہ شاعر نے ایک حدیث نبویؐ کے مضمون کو نظم کیا ہے۔ من جملہ اور کلاموں کے امام صاحب کا ایک یہ کلام بھی ہدایت آمیز ہے۔ لَيْسَ الْعِلْمُ بِكَثْرَةِ الرِّوَايَةِ إِنَّمَا هُوَ نُورٌ يَضَعُهُ اللّٰهُ فِي الْقَلْبِ۔ ''یعنی بکثرت روایت کرنے کا نام علم نہیں ہے وہ تو ایک نور ہے اللہ تعالیٰ جس کے دل میں چاہتا ہے اسے ڈال دیتا ہے''۔ یہ کلمہ ایک ایسی تحقیق رکھتا ہے جو نہایت گہری ہے چنانچہ اہل بصیرت اسے خوب جانتے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۱)

بے مقصد سوالات کے حکیمانہ جوابات

۱ ..... یحییٰ بن خلف بن ربیع طرطوسی نے جو اپنے وقت کے صالحین اور عابدین کے زمرہ میں داخل تھے یہ فرمایا کہ میں ایک روز مالک بن انسؒ کی خدمت میں حاضر تھا، دفعۃً ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ قرآن کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں مخلوق ہے یا نہیں؟ امام نے فرمایا کہ اس زندیق کو قتل کر ڈالو، اس کے کلام سے ہزاروں فتنے پیدا ہوں گے، چنانچہ امام مالکؒ کے بعد اس مسئلہ میں عجیب فتنہ برپا ہوا۔ اہل سنت کی ایک بڑی جماعت ذلیل اور مقتول ہوئی۔

۲ ..... اسی طرح جعفر بن عبداللہ سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم امام مالکؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی'' کی تفسیر میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ استویٰ کس کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے؟ امام صاحب نے اس سوال سے بہت ملال کا اظہار فرمایا اور زمین کی طرف دیکھنے لگے اور حیران ہو گئے، پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ:

استواء تو معلوم ہے اور اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے مگر اس کی کیفیت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ایسے امور سے سوال کرنا بدعت ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس شخص کو نکالو یہ بدعتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۴)

عظمتِ صحابہ

ابوعروہ سے جو حضرت زبیرؓ کی اولاد میں سے ہیں، یہ نقل ہے کہ ہم امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے، دفعۃً ایک شخص نمودار ہوا اور صحابہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے معائب اور نقائص ذکر کرنے لگا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ سنو۔ اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ الخ۔

''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ سخت ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں۔ تو ان کو رکوع اور سجدے میں دیکھتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔ سجدہ کے اثر سے ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے۔ تورات اور انجیل میں ان کی یہ صفت ہے کہ کھیتی نے اپنی سوئی اور پٹھا نکالا، پھر اس کی کمر کو مضبوط کیا پھر موٹا ہوا، پھر اپنی نال پر کھڑا ہوا۔ کھیتی کرنے والوں کو خوش اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سچے مسلمانوں کی وجہ سے کافروں کا دل جلاتا ہے''۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اصحابؓ کی طرف سے دل میں بدظنی رکھتا ہو اور ان کی شکر رنجی کو بُری طرح سے ظاہر کرتا ہو وہ اس لفظ کے حکم میں داخل ہے، اس کو خوب سمجھ لو اور یاد رکھو۔

(ایضاً ص ۲۵)

تحصیلِ علم ' انہاکِ کامل

چنانچہ منقول ہے کہ ایک دن یحییٰ بن یحییٰ المسعودی اندلسی امام کی خدمت میں حاضر ہو کر فیوضات کا استفادہ فرما رہے تھے، ان کے علاوہ اور اشخاص بھی امام صاحبؒ کی خدمتِ فیض درجت میں بہرہ یاب ہو کر

فیضیاب ہو رہے تھے کہ دفعۃً ہاتھی کے آنے کا شور وغل ہوا۔ چونکہ ملک عرب میں ہاتھی کو نہایت تعجب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بعض عرب کے رہنے والے ہاتھی کے دیکھنے کو فخریہ بیان کر کے مبارک بادی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ابوالشمق کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

يَاقُومِ اِنِّی رَاَيتُ الفِيلَ بَعدَكُم
فَبَارَكَ اللّٰهُ لِی فِی رُؤيَةِ الفِيل
رَاَيتُهُ وَلَهُ شَئٌ يُحَرِّكُهُ
فَكِدتُّ اَصنَعُ شَيئًا فِی السَّرَاوِيل

اے میری قوم میں نے تمہارے بعد ہاتھی کو دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ہاتھی کے دیکھنے میں میرے لئے برکت دے۔

وہ اپنی کسی چیز (یعنی سونڈ) کو حرکت دے رہا تھا، جب میں نے اس کو دیکھا تو ڈر گیا اور قریب تھا کہ میں اپنے پائجامہ میں کچھ کر دوں۔

اس واسطے حاضرین کی جماعت کے اکثر افراد امام کی صحبت کو ترک کر کے ہاتھی کا تماشا دیکھنے کو دوڑ پڑے مگر یحییٰ بن یحییٰ اپنی اسی ہیئت وحالت کے ساتھ بیٹھے ہوئے فیض حاصل کرنے میں مشغول رہے اور نہ کسی قسم کا اضطراب پیش آیا، نہ کوئی حرکت بیساختہ ان سے ظاہر ہوئی۔

امام صاحبؒ اسی وقت سے ان کو عاقل کے خطاب کے ساتھ مخاطب فرمایا کرتے تھے۔

یحییٰ بن یحییٰ کو علم حدیث وفقہ کی وجہ سے جو کچھ وجاہت تھی اس کے علاوہ ریاست ظاہری اور بادشاہوں کا تقرب اور امیروں کی نظروں میں

بھی ان کو امتیاز و عزت پوری طرح حاصل تھا۔ اگر چہ دینداری اور پرہیز گاری کے اعتبار سے بھی اس جماعت والے ان کو نہایت مکرم اور معظم جانتے تھے۔ مگر بایں ہمہ کبھی عہدۂ قضاء اور ولایتِ افتاء وغیرہ کو جو عنوانِ علم سے چند اں منافات نہیں رکھتے، قبول نہیں کیا۔ لیکن اس زمانہ کے سلاطین اور اس وقت کے امراء کے نزدیک ان منصب والوں سے ان کا مرتبہ زیادہ تھا۔ ابن حزمؒ نے کسی موقع پر یہ لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے مذہبوں کو ریاست و سلطنت کے سبب سے دنیا میں زیادہ رواج و عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ قاضی ابو یوسفؒ جن کے ہاتھ میں تمام ملکوں کی قضا تھی، جب کبھی کسی شخص کو قاضی بنا کر بھیجتے تھے، تو ان سے یہ شرط کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق حکم اور عمل کروگے۔ علیٰ ہذا اندلس میں یحییٰ بن یحییٰ کو شاہانِ وقت کی بارگاہوں میں اس قدر جاہ و مرتبہ حاصل تھا کہ کوئی قاضی ان کے مشورہ کے بغیر مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے احباب اور دوستوں کے سوا اور کسی کو قاضی یا متولی بنانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ (ایضاً ص ۳۳)

شوقِ حدیث

مشہور محدث علی بن عمر دارقطنی کی جوانی کے زمانہ میں اسماعیل صفار کی مجلس میں نشست رہا کرتی تھی، ایک دن صفار مذکور ان کو حدیثیں لکھوا رہے تھے۔ جب ایک جزو کے قریب لکھ چکے تو صفار نے یہ کہا کہ تمہارا سماع صحیح نہیں ہے، کیونکہ تم لکھنے میں ایسے مشغول رہتے ہو کہ حدیث کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ دارقطنی نے ان کے جواب میں عرض کیا

کہ جناب کو یاد ہے کہ اس وقت تک مجھ کو کتنی حدیثیں لکھوائی ہیں صفار نے کہا مجھے تو یاد نہیں۔ دار قطنی نے عرض کیا کہ اس وقت تک اٹھارہ حدیثیں لکھوائیں ہیں۔ اوّل حدیث فلاں از فلاں تا آخر سند علی ہذا ثانی حدیث از فلاں از فلاں۔ اسی طرح سب حدیثوں کی سندوں کے راویوں کے نام اوّل سے آخر تک مع متن حدیثیں انہیں حفظ پڑھ کر سنائیں۔ تمام اہل مجلس کو ان کی قوت حافظہ پر تعجب ہوا۔ (ایضاً ص ۱۲۰)

امام دار قطنیؒ کے لطائف وظرائف

(۱) امام دار قطنی کے لطائف وظرائف میں سے یہ واقعہ ہے کہ ایک دن ابوالحسن بیضاوی کسی ایسے شخص کو جو دور دراز سے حدیث کی طلب میں آیا تھا ان کے پاس لائے اور یہ کہا کہ یہ شخص غریب دور دراز سے سفر کر کے آیا ہے، آپ اس کو کچھ حدیثیں لکھوا دیجئے، تو آپ نے لطائف الحیل سے ٹالنے کے لئے جواب دیا کہ مجھے فرصت نہیں۔ جب ابوالحسن بیضاوی نے بہت اصرار کیا، تو اسے بیس (۲۰) سندیں ایسی لکھوائیں، جن کا متن یہ تھا کہ

"نِعمَ الشَّئُ الهدية أَمَام الحاجة"

(اپنی حاجت ظاہر کرنے سے قبل کچھ ہدیہ پیش کرنا بہت اچھا طریقہ ہے)

دوسرے دن وہ مردِ غریب کوئی مناسب ہدیہ لے کر حاضر ہوا، تو اسے سترہ (۱۷) سندیں لکھوائیں اور ان کا سب کا متن یہ تھا،

اذا اتاكم كريمُ قومٍ فاكرموه

(جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کا احترام کیا کرو)

(۲) ان کا ایک یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ ایک روز نوافل ادا کر رہے تھے اور ایک دوسرا شخص ان کے متصل بیٹھا ہوا کسی حدیث کا کوئی نسخہ پڑھ رہا تھا۔ اس نسخہ کے راویوں کے ناموں میں ایک نام نُسَیر آیا۔ جو نون اور سین مہملہ اور یاء تصغیر سے ہے۔ اس پڑھنے والے نے بشیر باء موحدہ اور شین معجمہ سے پڑھا، تو دار قطنی نے اسے اس غلطی پر متنبہ کرنے کیلئے نماز ہی میں سبحان اللہ کہا۔ پڑھنے والے نے دوسری مرتبہ یسیر بضم یاء تحتانی پڑھا۔ جب دار قطنی نے خیال کیا کہ صحیح لفظ پر متنبہ نہیں ہوا، پھر دار قطنی نے سبحان اللہ کہا، مگر وہ نہ سمجھا، تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔

"نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ"

تا کہ وہ سمجھ جائے کہ اس راوی کا نام نون کے ساتھ ہے۔

ف:- نماز میں اس طرح پر تلقین کرنا شوافع کے یہاں جائز ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک درست نہیں۔

(۳) اسی طرح ایک دن پھر نفل ادا کر رہے تھے ایک پڑھنے والے نے حدیث عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھا، تو دار قطنی نے سبحان اللہ کہا۔ پڑھنے والے نے پھر سند کا اعادہ کیا اور اس نام پر رُک گیا تو دار قطنی نے یہ آیت تلاوت کی،

"يَاشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ"

وہ سمجھ گئے اور بجائے سعید کے شعیب پڑھنے لگے۔

امام شافعیؒ اور مسئلہ تقدیر

یعنی حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے تقدیر کے بارے میں

سوال کیا گیا آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

اِذَا شِئتَ کَانَ وَ اِن لَّم اَشَاء

وَمَا شِئتُ اِن لَّم تَشَاء لَم تَکُن

(اے اللہ جس چیز کو تو چاہتا ہے وہ ہو جاتی ہے اگر چہ میری خواہش نہ ہو اور جس چیز کو آپ نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتی گو میری خواہش ہو)

خَلَقتَ العِبَادَ عَلٰی مَا عَلِمتَ

فَفِی العِلمِ یَجرِی الغِنیٰ وَالمِنَن

(آپ نے اپنے علم کے موافق بندوں کو پیدا کیا، اس کے موافق ہی غنیٰ اور احسانات جاری ہوتے ہیں)

عَلٰی ذَا مَنَنتَ وَ ھٰذَا ذَلَلتَ

وَھٰذَا اَعَنتَ وَ ذَا لَم تُعِن

(اس پر آپ نے احسان کیا اور اس کو ذلیل، اس کی امداد دی اور اس کی نہ کی)

فَمِنھُم شَقِیٌّ وَ مِنھُم سَعِیدٌ

وَمِنھُم قَبِیحٌ وَ مِنھُم حَسَن

(پس ان میں سے بعض بد بخت ہیں اور بعض نیک بخت، بعض بدصورت اور بعض خوبصورت)۔ (ایضاً ص ۱۳۲)

امام بیہقیؒ کے چند اشعار

مَنِ اعتَزَّ بِالمَولیٰ فَذَاکَ جَلِیلٌ

وَمَن رَامَ عِزًّا عَن سِوَاہُ ذَلِیلٌ

(جس شخص کو خدا تعالیٰ نے عزت دی تو وہ بزرگ ہے اور خدا کے سوا اگر کسی دوسرے سے عزّت کا طالب ہوا تو وہ ذلیل ہے)

وَلَو اَنَّ نَفسِی مُذ بَدَاَهَا مَلِیکُهَا
مَضٰی عُمرُهَا فِی سَجدَةٍ لَقَلِیلٌ

(میرے نفس کی جب سے اس کو اس کے مالک نے پیدا کیا ہے اگر تمام عمر سجدہ (عبادت) میں گزر جائے تو نہایت قلیل ہے)

اُحِبُّ مُنَاجَاةَ الحَبِیبِ بِاَوجُهٍ
وَلٰکِن لِسَانُ المُذنِبِینَ کَلِیلٌ

(میں اپنے حبیب کی مناجات کو عمدہ طریقہ سے پسند کرتا ہوں لیکن گنہگاروں کی زبان گونگی ہے)۔(ایضاً ص ۱۳۶)

علامہ حُمیدیؒ کے چند اشعار

یہ قطعہ اِن کی مشہور نظموں میں سے ہے اور درحقیقت بہت نافع و مفید ہے۔

لِقَاءُ النَّاسِ لَیسَ یُفِیدُ شَیئًا
سِوَی الهَذَیَانِ مِن قِیلٍ وَ قَال

(لوگوں کی ملاقات کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی۔ سوائے بکواس اور نرمی گفت و شنید کے)

فَاَقلِل مِن لِقَاءِ النَّاسِ اِلَّا
لِاَخذِ العِلمِ اَو اِصلَاحِ حَال

(پس لوگوں کی ملاقات کو کم کر۔ مگر تحصیل علم کے لئے یا اصلاح حال کی

خاطر)۔(ایضاً ص ۲۱۴)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ عینیؒ، علمی ادبی لطیفہ

ان کے لطائف میں سے ایک یہ ہے کہ جب سلطان نے مدرسۂ مؤیدیہ کی تعمیر کو تمام کیا اور اس کے مناروں میں سے ایک منارہ جو برجِ شمالی پر بنا ہوا تھا، گرنے کی قریب ہوا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے گرا کر پھر از سرِ نو تعمیر کرو۔ اتفاقاً علامہ عینیؒ جو بخاری کے شارح ہیں، اس منارہ کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔

حافظ ابن حجرؒ نے یہ قطعہ نظم کر کے بادشاہ کے حضور میں پڑھا۔ ؎

لِجَامِعِ مَولَانَا المُؤَیَّدِ رَونَقٌ
مَنَارَتُهٗ بِالحُسنِ تَبدُو وَ بِالزَّینِ

(ہمارے مولانا موید کی جامع مسجد کا منارہ رونق دار اور حسن و زینت کے جامہ میں ظاہر ہوتا ہے)

تَقُولُ وَ قَد مَالَت عَنِ القَصدِ اِمهَلُوا
فَلَیسَ عَلیٰ جِسمِی اَضَرُّ مِنَ العَینِی

(استقامت چھوڑ کر جھکتے وقت کہتا تھا کہ مجھے مہلت دو کیونکہ میرے جسم پر عینی سے زائد مضر کوئی چیز نہیں ہے)

لوگوں نے یہ قصہ عینیؒ تک پہنچایا اور کہا کہ حافظ ابن حجرؒ نے آپ پر تعریض کی ہے۔ بدرالدین عینی اس بات سے بہت خشمناک ہوئے وہ تو خود شعر کہنے پر قادر نہ تھے۔ اس لئے نواحی مشہور شاعر کو بلا کر ابن حجرؒ کی تعریض میں ایک قطعہ نظم کرا کر شائع کرایا۔ وہ پُر لطف قطعہ یہ ہے۔ ؎

مُنَارَةٌ كَعُرُوسِ الحُسنِ قَد حُلِيَت

وَ هَدمُهَا بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَالقَدرِ

(منارہ عروس حسن کی طرح زینت دیا گیا ہے اور اس کا گرنا اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر سے ہے)

قَالُوا اَصَابَت بِعَينٍ قُلتُ ذَا غَلَطٌ

مَا اَوجَبَ الهَدمَ اِلَّا حِطَّةُ الحَجَرِ

(لوگوں نے کہا کہ عینی کی وجہ سے ضرر پایا ہے، میں نے کہا یہ غلط ہے، اس کا گرنا تو صرف حجر (پتھر) کے علیحدہ ہو جانے سے ہے)۔

(ایضاً ص ۳۰۵)

ایک ڈائری یا تجربوں کی تجوریاں

آج سے کوئی سولہ سترہ سال قبل مادر علمی جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانہ میں ''محمد علیؒ کی ذاتی ڈائری'' کے مطالعہ واستفادہ کا موقع ملا تھا۔ محمد علی سے مراد ''مولانا محمد علی جوہرؒ'' ہیں اور کتاب کے مصنف ادیبِ شہیر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں۔ کتاب کیا ہے؟ علم وادب، تاریخ اور عبر ونصائح کا مرقع اور تجربوں کی تجوری ہے۔ اس وقت تک چین نہیں ملا جب تک کتاب مکمل نہ کر لی۔

ایک مرتبہ سہگل آباد ضلع جہلم میں مولانا محمد صادق مغل مرحوم مترجم فتاویٰ عالمگیری کی دعوت پر ایک علمی تقریب میں شرکت اور خطاب کا موقع ملا تھا۔ دورانِ تقریر مولانا محمد علی جوہرؒ کا کوئی واقعہ بیان کیا اور حوالہ محمد علیؒ کی ذاتی ڈائری'' کا دیا، پھر کیا ہوا، اچانک ایک بزرگ پروفیسر وجد میں آگئے اور جلسہ کے عین وسط میں کود ے، وجد میں جھومنے لگے اور ان کی زبان پر بس ایک ہی جملہ تھا ''محمد علی کی ذاتی ڈائری'' وہ بار بار اس کا تکرار کر رہے تھے۔

میری تقریر رک گئی، کوئی تین منٹ کے بعد وہ سنبھلے یا ساتھیوں نے سنبھالا دیا، تب سے میرا بیان پھر شروع ہوا۔ بیان ختم ہوا تو وہ اپنی وجدانی کیفیات کے ہاتھوں بے سدھ نڈھال ہو چکے تھے۔ ساتھیوں کا سہارا لے

کر میرے پاس آنے لگے، مگر میں لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھ پر بے حد شفقت فرمائی، پیار دیا، میں نے پوچھا، حضرت! کیا حال ہے؟ فرمانے لگے بدحال بھی کیا اور پوچھتے بھی ہو؟ مجھے حیرت ہوئی تو از خود فرمایا: ''محمد علیؒ کی ذاتی ڈائری'' میری دل کی دھڑکن ہے، اسے صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ حرزِ جان بنایا ہے، جملہ جملہ یاد ہے اور محمد علی جوہر میرے محبوب رہنما ہیں۔ آپ نے بھی تو وہی ساز چھیڑ دیا؟ جو میرے دل کی آواز ہے، کہنے لگے جب کتاب، صاحبِ کتاب اور صاحبِ سوانح کا ذکر آیا تو بے قابو ہو گیا۔ احقر کو جب اسی کتاب کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا تو چند اشعار اقتباس بھی محفوظ کر لئے تھے، مگر اصل کتاب سامنے نہیں تھی جو ہندوستان کی چھپی ہوئی تھی۔ چند روز قبل یہی کتاب ''مولانا محمد علی جوہر سیرت و افکار'' کے نئے نام سے کراچی کے ایک ادارے سے چھپ کر آ گئی اور میں اس کے بعض اقتباسات کو مرتب کر چکا تھا۔ کتابت بھی ہو چکی تھی، اب اضافہ یا ترمیم یہ ہوئی کہ ہندوستانی مطبوعہ کتاب کے بجائے ادارہ علم و فن کراچی سے چھپنے والی کتاب کے صفحات کے حوالہ جات درج کر دیے ہیں۔

کتابوں کے مفت خورے

مولانا محمد علی جوہرؒ نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس وقت ایک خط لکھا جب وہ تصنیف و تالیف اور طبع و اشاعت کے میدان میں نو وارد تھے اور ان کی انگریزی کتاب ''سائیکالوجی آف لیڈرشپ'' نئی نئی چھپ کر آئی تھی۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنی کتاب کا اشتہار، خود لفافہ میں بند کر کے خط کے بغیر مولانا جوہر کو چھنڈواڑہ سی پی میں پوسٹ کر دیا تھا

جہاں وہ نظر بند تھے۔ مولانا جوہر نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ کتابوں کے مفت خوروں کیلئے باعث عبرت ہے۔

ذیل میں وہی خط من وعن نذر قارئین ہے جو چھندواڑہ سی پی سے ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا۔

مکرم !

کوئی مہینہ بھر ہوتا ہے کہ انگریزی کتاب ''سائیکالوجی آف لیڈرشپ'' (مطبوعہ ٹی، فشر انون لندن) کا ایک اشتہار موصول ہوا تھا۔ لفافہ کے اندر سوا اس اشتہار کے اور کچھ نہ تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشتہار آپ کے ایما سے یا کم از کم آپ کے علم میں میرے پاس روانہ کیا گیا تھا اگر کتاب آپ ہی کی تصنیف ہے تو یقیناً دلآویز ہوگی۔ متعدد ولایتی اور ہندوستانی اخبارات کی مدحیہ رائیں اس اشتہار میں پڑھ ہی چکا تھا کہ ایک مفصل ریویو مسز بسنت کے روزنامہ ''نیوز انڈیا'' (مدراس) میں نظر سے گزرا، جو بہت ہی مداحانہ تھا۔

اچھا، تو میں اب بجائے مشتہر صاحب کے براہ راست آپ ہی کو لکھتا ہوں کہ کتاب کی ایک کاپی میرے نام وی پی بھجوا دیجئے۔ اس وی پی کی فرمائش کو کتاب کا نسخہ مفت ہاتھ آنے کے لئے حسن طلب نہ سمجھئے گا۔ مجھے یہ دل سے ناپسند ہے کہ مصنف کے احباب اس سے کتاب وصول کرنے کی گھات میں رہیں۔ اب وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ مصنفین غریب کو شاہانہ سرپرستیاں حاصل ہوں۔ کتابیں اگر فروخت نہ ہوں تو آخر طبع و اشاعت کے مصارف کہاں سے نکلیں

گے اور ان میں اگر دوست احباب ہی بخل کرنے لگیں تو پھر امید کس سے رکھی جائے؟

مخلص محمد علی (۲۳ مئی ۱۹۱۶ء)

(مولانا محمد علی جوہر سیرت وافکار ص ۲۰..... از مولانا عبدالماجد دریابادی)

جوہر کی ایک نعتیہ غزل

شعر سننے اور کہنے کا چسکا تو محمد علی کو شروع ہی سے تھا، کچھ نہ کچھ شعر لڑکپن ہی سے نکال لینے لگے تھے۔ حضرت داغ کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ کالج پہنچتے پہنچتے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ قومی، ملی، سیاسی زندگی میں بڑھے تو فرصت عنقا۔ بقول شخصے بات کرنے کی بھی فرصت سے محروم اب شعر گوئی کی مہلت قید یا نظر بندی ہی کی زمانہ میں ملتی اور جوہر کی شاعری کی جوہر اسی وقت چمکتے۔ ۲۲ء کا غالباً وسط تھا کہ مولانا محمد علی جوہر کی ایک نعتیہ غزل بیجاپور جیل کی چار دیواری اور پابندیاں توڑتی ہوئی پاسبانوں اور پہرہ داروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی کسی طرح فرنگی محل پہنچ گئی اور وہیں سے مجھے ہاتھ لگی..... ایک مجھی پر موقوف نہیں، خدا جانے دست بدست، نقل در نقل ہوتے کتنی پھیل گئی، کہاں کہاں پہنچ گئی، کن کن کی زبانوں پر چڑھ گئی..... آخر دور طباعت سے قبل پوری پوری کتابیں بھی تو اسی طرح ہاتھوں ہاتھ پھیل جایا کرتی تھیں۔

غزل کیا تھی، شاعر کے جذبات قلب کی ہو بہو ترجمان، شیدائے رسول ﷺ کے چہرے کا عکس ایک شفاف آئینہ میں! قوالوں نے اسے گایا شاعروں نے اس پر غزلیں کہیں، رسائل و اخبارات اسے مدتوں شائع کرتے رہے، عجب نہیں، جو آپ بھی سن چکے ہوں۔ خیر آج قند مکرر

کا لطف سہی۔ شعر پڑھنے سے قبل شاعر کا جیل کے اندر عالم تنہائی مستحضر کر لیجئے.....

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مدارتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں دردوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

(ایضاً ص ۹۷)

ایک نالۂ و فریاد

محمد علی کی زندگی ہی آزمائشوں کے لئے وقف تھی۔ اب کی بار ایک بڑی سی کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اولاد میں لڑکا تو کوئی تھا نہیں، لڑکیاں چار تھیں۔ چاروں بڑی دلاری، بڑی چہیتی اور کیسے نہ ہوتیں، جو دوسروں کی اولاد کیلئے بیتاب ہو جاتا تھا وہ خود اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کے پیچھے کیسا کچھ دیوانہ نہ رہتا! منجھلی صاحبزدی آمنہ ہی اور زیادہ عزیز تھیں محمد علی کے تازہ امتحان کے لئے انتخاب ان ہی کا ہوا۔ جوان اور تین چار ہی سال کی بیاہی ہوئی تھیں۔ ادھر باپ بیجاپور جیل میں بند ہوئے، اُدھر

یہ بیمار پڑیں۔ مرض بالآخر دق تجویز ہوا! خبر پہنچی تو دل مسوس کر، کلیجہ تھام کر رہ گئے، باہر ہوتے تو دوا علاج کی دوڑ دھوپ میں زمین آسمان ایک کر دیتے۔ اس وقت اتنا بس بھی نہیں کہ ایک نظر آ کر دیکھ ہی لیں۔

ایک نالۂ موزوں میں اپنے پروردگار سے فریاد کی۔ پوری نظم اسی زمانہ میں روزنامہ خلافت (اُس زمانہ کے خلافت) میں ''پیام مجلس'' کے عنوان سے نکل بھی گئی تھی، مخاطبت براہ راست مدقوق بیٹی سے ہے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحان سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ساتویں شعر میں کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور نازوں کی پالی بیٹی کو مخاطب کرتے ہیں، لیکن نظریں عرش والے مالک دمولیٰ ہی کی طرف اٹھی ہوئی ہیں: ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

دسویں شعر میں پھر مقام تفویض و توکل پر غالب آ گئی ہے.....
بندہ اپنے مالک کے قدموں پر گرا ہوا گڑگڑا رہا ہے..... ؎

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آگے قصۂ یعقوب علیہ السلام کی تلمیحات ہیں اور اس کے بعد چودھویں شعر میں پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں..... ؎

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

(ایضاً ص ۱۰۳)

محمد علی جوہر

تلاوت قرآن اور حدیث و سیرت نبوی وغیرہ کے مطالعہ سے جو وقت بچتا، وہ زائروں اور مہمانوں کی خاطر داری میں صرف ہوتا۔ محمد علی غضب کے مہمان نواز اور دوست پرست تھے۔ اچھا کھانے کے بڑے شوقین، لیکن اس سے بھی زیادہ دوسروں کو اچھا کھلانے کے حریص۔ قرض لیں یا کسی سے مانگ کر لائیں، بہر حال دوستوں کو کھلانا اور خوب ہی کھلانا فرض، جو ان کے مہمان نہ بھی ہوتے، انہیں بھی پکڑ پکڑ لاتے اور ٹھونس ٹھونس کر انہیں کھلاتے ضرور۔ بذلہ سنج ایسے کہ روتے ہوؤں کو بے ہنسائے نہ رہیں۔ رقیق القلب اتنے کہ بات بات پر، بلکہ بلا بات کے بھی آنسوؤں کے دریا بہا دیں۔ شخصیت ایسی جامع و ہمہ گیر کہ دینی تاریخی، ادبی، سیاسی، شعری ہر موضوع سے یکساں دلچسپی اور سب یکساں تیار، طبیعت ہر وقت حاضر، کوئی تذکرہ کسی قسم کا چھڑ جائے، تو بس اب ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ان محفل طرازیوں سے بھی جب فرصت ملتی تو دور افتادہ دوستوں، عزیزوں کی یاد آتی اور ان کے آئے ہوئے خطوں کے جواب کی طرف توجہ ہوتی اور وہی زندہ شخصیت خطوط میں جھلکتی رہی۔ ہر خط ایک پند نامہ، لیکن خشک ذرہ بھر بھی نہیں، بلکہ حد کمال تک دلکش و شگفتہ۔ (ایضاً ص ۲۳)

تاریخ نگاری نہیں تاریخ سازی

1916ء میں ایک بار اپنے نزدیک بڑی ہوا خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انہیں لکھا کہ آپ تو تاریخ کے جید عالم ہیں، یہ جبر یہ فرصت کا زمانہ آپ خالی کیوں جانے دیتے ہیں۔ کیوں نہ کوئی کتاب تاریخ پر لکھ ڈالئے جواب آیا (مراسلت کی زبان ابھی انگریزی ہی تھی) اور کتنا سچا آیا کہ ''یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں، تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار تاریخ بنا رہے ہیں اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کی صلاح دے رہے ہیں۔ عالم اسلامی کی بربادیوں نے دل و دماغ میں وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے، جو میں تصنیف و تالیف پر توجہ کر سکوں''۔ (ایضاً ص ۲۴)

جوہر کے جواہر

جوہر کی اردو شاعری کے جوہر سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ یہ امر میرے فخر کے لئے کافی ہے کہ ان کے اس جوہر کا انکشاف سب سے پہلے میرے ہی نام کے ایک عنایت نامہ میں ہوا اور پھر میں نے ہی اسے خوب پھیلایا۔ جس روز ان کے خط میں کوئی غزلنامہ آتا، ایک ایک شعر پر واہ واہ کی دھوم مچتی اور دفتر کا خشک کاروبار کچھ دیر کیلئے بزم مشاعرہ کی چہل پہل میں تبدیل ہو جاتا۔ دو چار پھڑکتے ہوئے شعر ابھی اور سی منٹ سن لیجئے۔ حالی کی غزل ''وفا کے بعد، سزا کے بعد'' پر غزل کہی اور کیا خوب کہی۔ مطلع لاثانی تھا.....

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو میں گویا ضرب المثل بن گیا ہے ..... ؎

قتل حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اس شعر نے تو خدا معلوم کتنے کشتگانِ یاس کو بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے زندہ کر دیا ہے ..... ؎

اک شہر آرزو پہ بھی ہو نا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

غالب کی مشہور غزل ''تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی'' پر یہ غزل کہنا بھی جوہر ہی کا کام تھا ..... ؎

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
رب عزت کیلئے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت
شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

(ایضاً ۲۵)

مولانا محمد علی جوہر کی ایک غزل

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کرلو
سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

ربِ عزت کیلئے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کردو
تم وفادار ہو تھوڑی ہی وفا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
مالک الملک پہ ایماں کی سزا اور سہی

جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہے
اس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

بندگی میں تری سہتے ہی ہیں لوگ لپٹیں
چند دن کیلئے دوزخ کی ہوا اور سہی

دل تو جا ہی چکا گر جان بھی جاتی ہے تو جائے
ترکشِ کفر میں اک تیر قضا اور سہی

ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذر حیا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

کیا زندگی جو دل میں کوئی آرزو نہ ہو
رہتی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرت جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

(ایضاً ص ۴۹-۵۰)

محمد علی جوہرؔ ذوق مطالعہ اور عشق رسولؐ

ہمدم (لکھنؤ) اس وقت زوروں پر نکل رہا تھا اور یوپی اور دہلی میں کہنا چاہئے کہ وہی ایک روزنامہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مالک آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم تعلقہ دار گدیہ تو بالکل دوسرے سیاسی مسلک کے تھے، لیکن ایڈیٹر سید جالب مرحوم ایک زمانہ میں خاص رفیق مولانا محمد علی کے رہ چکے تھے اور ہمدرد میں کام کئے ہوئے تھے۔ یہ علی برادران کے حالات تفصیل کے ساتھ چھاپتے رہتے اور مسلمانوں کا مذاقِ عام اس وقت مانگ بھی اسی چیز کو رہا تھا۔ جالب مرحوم کہیں سے

(غالباً فرنگی محل سے) مولانا کا ایک خانگی مکتوب ہاتھ آ گیا۔ حسب معمول خوب مفصل تھا اور اس میں مولانا کے قلم سے والٹیر سے کراچی تک کا سفرنامہ درج تھا۔ ہمدم نے اسے بجنسہٖ شائع کر دیا۔ دریابادمیں ڈاک اس وقت صبح، کچھ دن چڑھے تقسیم ہوتی تھی۔ پرچہ جس وقت آیا، بیت الخلاء جارہا تھا، پرچہ ہاتھ میں لئے وہیں چلا گیا اور فرط اشتیاق میں وہیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیا..... خدا کے لئے کوئی صاحب یہاں پہنچ کر لاحول ولاقوۃ پڑھ کر اس عمل کے جواز وعدم جواز کی فقہی بحث نہ چھیڑ دیں بیان نفس واقعہ اور فرطِ اشتیاق کا ہو رہا ہے نہ کسی مسئلہ کے جواز و عدم جواز کا۔

خط کے اور حصے بھی مؤثر تھے، لیکن جب اس مقام پر نظر پہنچی کہ "رات کے طول طویل گھنٹے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر برابر ورد زبان رہا کہ ؎

وہاں پہنچ کے یہ کہیو صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

تو معاً آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہو گیا..... دنیا بھی کیسی اندھی تھی اور آج تک اندھی چلی آ رہی ہے۔ محمد علی کو دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح محض ایک سیاسی لیڈر سمجھنا کتنا کھلا ہوا ظلم تھا! جو اپنے آپ کو رسولؐ کی محبت میں فنا کئے ہوئے تھا، جس پر عشق اپنے دین کا سوار تھا۔ اُس کیلئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس کا منتہائے مقصود اپنے وطن کی آزادی اور ہندوستان کی خودمختاری تھا، یہ کیسی صریح ناانصافی اس کے حق میں بھی ہے اور اپنے حق میں بھی! محمد علی کو تو ہندوستان کی آزادی بھی اس لئے

عزیز تھی کہ اس سے حرمین شریفین بھی آزاد ہوسکیں گے! سچ کہا ایک دوسرے عارف اور دیوانہ (مولانا مناظر احسن گیلانی) نے دس سال بعد محمد علی کی موت پر ..... ؎

بہ دین مصطفیٰ دیوانہ بودی　　فدائے ملت جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی　　وگرنہ عاشق مستانہ بودی

(ایضاً ص ۸۹)

نورِ سحر

ماہنامہ القاسم کی چوتھی خصوصی اشاعت ''ابوحنیفہ ہند مفتی کفایت اللہ نمبر'' کی تیاری کے دوران مختلف مقالات اور متعدد مضامین پڑھنے کا موقع ملا، حضرت مفتی صاحبؒ کی سیرت وسوانح کے بعض پہلوؤں نے دل ہلا کے رکھ دیا۔ علم وعمل، اخلاق، عزم وہمت اور بلند کردار، تواضع و عبدیت، استغناء، علمی وفقہی بصیرت اور بعض فتاویٰ نے دل موہ لیا۔ دورانِ مطالعہ بعض دل کو چھونے والے اقتباسات اپنی ذاتی ڈائری ''جگر لخت لخت'' میں محفوظ ہوتے رہے اور اب نورِ سحر کے عنوان سے ''سراغ زندگی'' کا حصہ بن رہے ہیں۔

ٹوپیاں بُن کر تحصیل علم کرتے رہے

مراد آباد کے قیام کے دوران کھانے کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا۔ تعلیم کے دیگر اخراجات آپ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ آپ کے والد نادار تھے، اس لئے وہ تعلیم کے پورے اخراجات برداشت نہ کر سکتے تھے اور دوسروں کے عطیات سے طبعاً نفرت تھی۔ تحصیل علم کے تمام زمانہ میں کسی مسجد میں قیام نہیں کیا۔ اپنی طالب علمی کے دوران میں تاگے کی ٹوپیاں کروشیا سے بنتے تھے اور فروخت کرتے تھے۔ بہت عمدہ

مختلف رنگ کے ریشمی پھول بناوٹ میں ہوتے تھے۔ دو تین روز میں ایک ٹوپی تیار ہوتی تھی۔ دو روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ وہ کتاب میرے پاس موجود ہے جس میں قلم سے آپ نے ٹوپیوں کے مختلف ڈیزائن اور نمونے بنائے تھے فنکاری اور ہنرمندی کا بہترین نمونہ ہے۔
(مفتی کفایت اللہ نمبر ص ۳۰)

ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہ دیتے

یہ چیز آپ کی فطرت میں داخل تھی کہ آپ کسی ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا نہیں ہزاروں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران اگر کوئی آجاتا تھا تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے اور جا کر ملاقات کرتے تھے اور اگر فتویٰ لے کر کوئی آتا تھا تو فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ غرض یہ کہ فتویٰ لکھنے کے لئے کوئی خاص وقت کبھی مقرر نہیں کیا چوبیس گھنٹے آرام و راحت حتیٰ کہ پوری زندگی افتاء اور اہل حاجت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ (ایضاً ص ۴۳)

تصویر کشی کا شرعی حکم

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ جب عالم اسلام کے راہنما ملک مصر کے اندر ''مؤتمر اسلامی'' میں شرکت کرنے تشریف لے گئے، جہاں ان کا غیر معمولی اعزاز کیا گیا کہ مؤتمر کے صدر کی داہنی طرف ان کو نشست دی گئی اور مجلس کے صدر بنائے گئے، نیز شیخ الازہر کا مرتبہ شاہ کے بعد سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا اور وہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ دو مرتبہ مفتی صاحبؒ کی قیام گاہ پر مزاج پرسی کرنے تشریف لائے، وہاں مفتی

صاحبؒ سے جب فوٹو کے بارے میں سوال کیا گیا، تو وہاں بھی مفتی صاحبؒ نے جواب میں اس کے حرمت کا ببانگِ دہل اعلان کیا۔ اس سوال و جواب کو ہم ایسی شخصیت کے حوالہ سے یہاں نقل کر رہے ہیں، جس کی عظمت کے آگے عوام کے ہی نہیں علماء عصر کے بھی سر جھکے نظر آتے ہیں۔ میری مراد مولانا عبدالحق مدنیؒ (وفات ۱۹۷۴ء) سے ہے، جن کی پیدائش مدینہ طیبہ کی ہے اور تعلیم و تربیت بھی اس مقدس سرزمین میں ہوئی یہ مولانا مدنیؒ، مفتی صاحبؒ کے رفیق سفر اور شریک مؤتمر تھے۔ وہ نقل فرماتے ہیں اور اس سوال و جواب کے الفاظ یہ تھے۔

علماء مصر : التصوير الممنوع انما هو الذى يكون بصنع الانسان و معالجة الايدى و هذا ليس كذلك انما هو عكس الصوره . (ممانعت تو صرف اس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کاریگری سے ہو، فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ یہ تو صورت کا عکس ہے)۔

حضرت مفتی صاحبؒ : كيف ينتقل هذا العكس من الزجاجة الى الورق . (یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے)

علماء مصر : بعد عمل كثير۔ (بہت کچھ کاریگری کے بعد)

حضرت مفتی صاحبؒ : اى فرق بين معالجة الايدى و ضع الانسان والعمل الكثير۔ (انسان کے عمل، ہاتھوں کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے)

علماء مصر : نعم هو شئى واحد۔ (کوئی فرق نہیں، وہ ایک ہی چیز ہے)

حضرت مفتی صاحبؒ : اذا حکمھا واحد . (لہٰذا حکم بھی سب کا ایک ہے)

علماء مصر حضرت مفتی صاحبؒ کی اس حاضر جوابی سے بے حد متاثر ہوئے اور کچھ ایسے خاموش ہوئے کہ کوئی جواب نہ دے سکے"۔

(ایضاً ص ۱۵۸)

تار کی خبر معتبر نہیں

ایک مرتبہ والئی چترال نے حضرت مفتی اعظمؒ کی خدمت میں ایک تار بھیجا، جس میں دریافت کیا گیا کہ دہلی میں عید کا چاند ہوگیا یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحبؒ موجود نہ تھے، مدرسہ امینیہ میں چند چترالی طلباء تھے انہوں نے تار کا جواب دے دیا کہ چاند ہوگیا۔ اس کے مطابق چترال میں صبح کو عید کر لی گئی۔ والئ چترال نے حضرت کو خط لکھا کہ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ایک بڑا اختلافی مسئلہ حل فرما دیا یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر نہیں ہوتی، تو آپ تار کا جواب نہ دیتے۔ حضرت مفتی اعظم صاحبؒ نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اس کے جواب کی مجھے قطعاً کوئی خبر نہیں، کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اس کا جواب دیا اور یہی تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بڑی دلیل ہے۔

دلچسپ لطیفہ

ایک مرتبہ ایک افغانی طالب علم نے حضرتؒ سے دریافت کیا کہ اگر کسی کو پیشاب کا قطرہ آجائے تو کیا کرے، فرمایا ڈھیلے سے خشک

کر لے، اس نے کہا اگر پھر آ جائے تو کیا کرے، فرمایا کپڑے سے پونچھ لے، کہا اگر پھر آ جائے، فرمایا پانی سے دھو لے، اس نے کہا اگر پھر آ جائے فرمایا انگیٹھی میں رکھ کر سکھا لے۔

مغرور مفتی

ایک مرتبہ مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند اور مولانا محمد عرفان صاحبؒ جو اس زمانے میں اخبار الجمعیۃ کے مدیر تھے اور مولوی حافظ عبدالغنی دہلویؒ حضرتؒ کے پاس دولت خانے پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ ضروری اور اہم معاملے پر گفتگو تھی۔ اسی دوران میں ایک شخص استفتاء لے کر آیا، آپ نے فرمایا کل لے جانا، اس نے اصرار کیا کہ ابھی جواب کی ضرورت ہے۔ آپ نے کام چھوڑ کر فتوے کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ دوسرے حضرات کو کچھ گرانی اور انقباض ہوا۔ مولوی عبدالغنی صاحب نے فرمایا کہ مولوی عبدالحق (مصنف تفسیر حقانی) نے فتویٰ کے جواب کے لئے خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص فتویٰ لے کر آتا تو جھڑک دیا کرتے تھے۔ اس پر مولانا محمد عرفان نے کہا کہ حافظ صاحب وہ زمانہ اور تھا اگر موجودہ دور میں ایسا کیا جائے تو دوسرے ہی دن دیواروں پر بہت بڑا پوسٹر دکھائی دے گا، جس کا عنوان جلی حروف میں ہوگا ''مغرور مفتی''۔ اس پر چاروں حضرات کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

تم اپنے ایمان کی خبر لو

مولوی عبدالحق نے ایک اور واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میں نے

خواب میں دیکھا کہ دارالحدیث میں صبح کے وقت ہم لوگ (یعنی درس حدیث کی جماعت) اپنے معمول کے مطابق آ کر بیٹھ گئے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ حضرتؒ تشریف لائیں تو سبق شروع ہو۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لا رہے ہیں جو بالکل حضرت مفتی اعظمؒ کے مشابہ ہیں اور حضرتؒ ہی کی طرح ان کی بھی داڑھی سفید ہے۔ دارالحدیث میں تشریف لاکر فرمایا کہ کیا تم لوگ پسند کرو گے کہ آج حدیث کا سبق میں تم کو پڑھاؤں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں، اپنا تعارف فرمایئے۔ فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں میرا نام محمد ﷺ ہے۔ ہم سب طلباء نے عرض کیا کہ حضرتؐ اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی کیا ہوگی کہ آپؐ حدیث پڑھائیں، آپؐ ہی کی تو حدیث ہے غرض کہ حضور علیہ السلام نے مسلم کی ایک حدیث پڑھائی اور تقریر فرمائی۔ مولوی عبدالحق نے کہا آپؐ کی وہ پوری تقریر مجھے آج تک یاد ہے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی اور صبح کو میں حسبِ معمول مدرسے پہنچا اور دارالحدیث میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں حضرت مفتی اعظمؒ تشریف لائے، اپنی مسند پر بیٹھ کر کتاب کھولی اور سبق شروع کرانے کا ارادہ فرمایا میں نے عرض کیا کہ حضرت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہو، میں نے رات کو جو خواب دیکھا تھا وہ سنایا، خواب سنتے ہی حضرت مسند پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا قبلہ رخ کھڑے ہو کر خدا کو گواہ کر کے کہ واقعی تم نے اسی طرح خواب میں دیکھا، میں نے حکم بجا لایا۔ آپؒ مسند سے ہٹ کر سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا عبدالحق تمہارا خواب سچا ہے وہ حضور پرنور ﷺ تھے جو اس دارالحدیث میں جلوہ افروز ہوئے تھے، مگر عبدالحق تم اپنے

ایمان کی خبر لو، تمہارا ایمان کمزور ہے تم نے حضور ﷺ کی داڑھی سفید دیکھی حالانکہ آپ ﷺ کی داڑھی سیاہ تھی۔

مولوی عبدالحقؒ نے یہ واقعہ ملا واحدی کی موجودگی میں سنایا اور کہا کہ حضرت مفتی اعظمؒ تقریباً چالیس روز تک مسند پر نہیں بیٹھے، بلکہ مسند کے سامنے طلباء کے ساتھ بیٹھ کر درس دیتے رہے۔

فتویٰ کفر سے احتراز

(۱) حضرت مفتی صاحبؒ کے ایک شاگرد مولوی سید محمد فاروق (ناظم ''بچوں کا گھر'') کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک استفتاء صوبہ سرحد سے آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنے خسر کو جو مشہور عالم دین تھے، زدوکوب کیا اور سخت توہین کی، اس پر جواب تھا اور بہت سے علماء کے تصدیقی دستخط تھے، تمام جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ عالم دین کی توہین دین کی توہین ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے، لہٰذا وہ شخص کافر ہوگا۔ مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ میں نے بھی ان تمام جوابات کی تصدیق کی اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تمام جوابات غلط ہیں، آپ نے فرمایا کہ مارنے والا کافر نہیں ہوا، کیونکہ اس نے عالم دین کی توہین نہیں کی، بلکہ اس شخص کی توہین کی ہے جو کسی خانگی اور نجی جھگڑے میں اس کا مخالف تھا، یہ الگ بات ہے کہ اتفاقاً وہ عالم دین بھی تھا، لہٰذا اس مارنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

(۲) ایک مرتبہ ایک استفتاء آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد کی تعمیر کی جارہی تھی ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا، وہ اس کی توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا

سا حصہ مسجد کو دیدے، اس نے مسجد کی شان میں نامناسب الفاظ کہے آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ مسجد چونکہ شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی توہین کفر ہے، لہٰذا وہ شخص کافر ہوگیا۔ جواب دیکھ کر حضرتؒ نے فرمایا کہ ابھی سے تم نے کافر سازی شروع کردی۔ مفتی بن جاؤ گے تو کیا کرو گے؟ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو، جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جاسکتا ہو، تو اس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا اس سوال میں تو مسجد کی کھلی ہوئی توہین ہے، پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے فرض کرو، وہ مسجد مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہوگئی ہو، اس لئے اس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں، اسلئے اتنی جلدی ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیئے۔

قادیانیوں سے مناظرہ

ایک مرتبہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہمرکاب تھا، جس ڈبے میں ہم دونوں تھے، اسی میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب دو تین بھاری بھرکم قادیانی مولوی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا، بڑا لسان دار اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے، مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرتؒ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتا تھا، مگر یہاں معاملہ دین کا ہے۔ اس لئے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو ابھی یہ فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضورؐ کی ہی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے، تو فرمائیے کہ حضور ﷺ کے اس قول لا نبی بعدی میں تو کسی خاص قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے، مطلق نبوت کی نفی ہے، ضمنی، غیر ضمنی اور ظلی، بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا، لائے نفی جنس نے نبوت کے تمام اقسام واصناف کی نفی کر دی ہے، پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟

قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے، اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں، اس لئے آپ کے ہی دین کی تجدید کے لئے نبی آسکتا ہے اور اس سے آپ کے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے فرمایا نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے، تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا۔ انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جا سکتا اور آنحضرت ﷺ تو آپ کے دعوے کے مطابق قیامت تک کے لئے نبی ہیں، پھر حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کیا

اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؟ بولیئے جواب دیجئے۔

حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا بولیئے جواب دیجئے، مگر ادھر ایسا سناٹا چھا گیا کہ صدائے برنخاست قادیانی یک دم مبہوت ہو گئے، بالکل جواب نہ دے سکے۔ پھر آپؒ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا کہنا کہ حضور قیامت تک کے لئے نبی ہیں خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوت کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی؟ اور اس کی ضرورت کیوں؟ بولیئے جواب دیجئے، مگر صدائے برنخاست۔

قادیانیوں پر اوس پڑ گئی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور ہونٹ خشک ہو گئے اور بالکل ساکت وصامت ہو گئے تو حضرت والد ماجدؒ نے تقریباً ایک گھنٹہ تک قادیانیت کی رد میں مسلسل تقریر کی۔

اس کے بعد دہلی کے ہمسفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ اپنا تعارف تو فرمایئے فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں، مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔

اس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا ڈبے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے بھی یہ تمام گفتگو سنی تھی، بہت شکریہ ادا کیا اور ان دولت مند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذبذب ہو گئے تھے، آپ نے بروقت ہماری دستگیری کی اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے نادم ہوئے کہ دہلی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم ہیں۔

ادھر قادیانی مولویوں کا یہ حال تھا کہ آپس میں ادھر ادھر کی باتیں

بھی بھول گئے تھے۔ اس وقت غالباً راقم الحروف کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی (اور اب غفلت و معصیت کی اٹھاون منزلیں طے ہو چکی ہیں) افسوس کہ والد ماجد کی بحث اور محققانہ تقریر خاصی طویل اور مفصل تھی، واقعہ کا خاکہ ذہن میں محفوظ تھا، جو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تحریر کر دیا ہے۔

غرض نقشے ست کزما یاد ماند
کہ ہستی رانمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت
کند درکار درویشاں دعائے

جمالِ یوسفؑ

باٹلی (برطانیہ) کے الحاج ابراہیم تسبیح والے جو مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ کے خلیفہ اجل اور وسیع تر بین الاقوامی تجارتی کاروبار کے باوجود، فکر و مراقبہ، انابت و عبدیت کے مظہر اتم ہیں، کی مخلصانہ اور محبانہ دعوت پر احقر نے رخت سفر باندھا اور جہاز میں مطالعہ کیلئے ماہنامہ بینات کی خصوصی اشاعت ''محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نمبر'' ساتھ لیا۔ پاکستان سے دوبئی تک، دوبئی میں تین (۷) گھنٹے قیام اور پھر دوبئی سے مانچسٹر تک، جب برطانیہ میں اترا، تو ۸۱۶ صفحات کی کتاب سے مطالعاتی استفادہ مکمل کرلیا۔ دورانِ مطالعہ جگہ جگہ، پسندیدہ واقعات، اقتباسات اور علم و مطالعہ اور عمل صالح کے محرک حکایات پر نشان لگاتا رہا۔ ''سُراغ زندگی'' کی ترتیب تکمیل کے مراحل میں تھی، حسن اتفاق سے اس خصوصی اشاعت پر نظر پڑی، فیصلہ یہی کرلیا کہ محدث العصر حضرت بنوریؒ کے جن واقعات اور حکایات نے خود مجھے فائدہ پہنچایا اور بے حد فائدہ پہنچایا وہ یقیناً طالبان علوم نبوت کے لئے نافع ہوں گے۔ اس لئے ذیل میں بینات کی خصوصی اشاعت سے خود محدث العصر حضرت علامہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے واقعات، حکایات اور بعض علمی و عملی اور روحانی حالات نقل کیئے جارہے ہیں۔

پاکدامنی وعفت

مولانا لطف اللہ پشاوری لکھتے ہیں

''ہم دونوں (صاحبِ تحریر اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ) دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، دونوں چھتہ مسجد کے حجرے میں رہتے تھے۔ ہماری عمر تقریباً ایک تھی، لیکن مجھے ان کی عفت و پاکبازی، حلم و حیا اور متانت و وقار نے بہت متاثر کیا، مجھے یاد نہیں کہ اس عنفوانِ شباب میں بھی ان سے کوئی حرکت متانت کے خلاف سرزد ہوئی ہو۔ (ص ۲۶)

خدمت وصحبتِ استاد

مولانا مرحوم کو امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ سے اسی زمانہ میں انتہا درجہ کی عقیدت پیدا ہوگئی تھی۔ دارالعلوم میں قیام پر کچھ عرصہ گزرا، تو آپ نے عربی میں ایک طویل خط حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں لکھا، جس میں ان سے استدعا کی گئی تھی کہ مجھے اپنا خادم بنالیں۔ شاہ صاحبؒ نے خط پڑھا، لے کر رکھ لیا اور دوسرے وقت آنے کو کہا، مولانا مقررہ وقت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلا سوال کیا کہ ادب کہاں پڑھا ہے؟ عرض کیا ''کہیں نہیں''۔ فرمایا، بس آپ کو حاجت نہیں، اتنا کافی ہے''۔ (درخواست کے جواب میں فرمایا تھا ''میں آپ کو اپنے ساتھ ملحق کرلوں گا'')

استاذ کی رفاقت، دیوبند چھوڑ دیا

میں تو امتحان دے کر وطن پشاور آ گیا، ادھر دیوبند میں مشہور زمانہ

اسٹرائک ہوگئی، جس میں مولانا محمد انور شاہ، مولانا شبیر احمدؒ، مولانا بدر عالمؒ اور مولانا سراج احمدؒ وغیرہ کے مہتمم حضرات سے اختلافات ہوئے اور فیصلہ ہوا کہ یہ حضرات دارالعلوم سے علیحدہ ہوکر کسی اور جگہ تشریف لے جائیں، پچانوے فیصد طلبہ بھی ان کے ساتھ تھے، اس لئے ایسی جگہ کی تلاش ہوئی، جو ان مدرسین کے ساتھ ان سب طلباء کا بوجھ بھی برداشت کر سکے۔ بالآخر ڈابھیل کے سیٹھ گارڈین اور موسیٰ میاں وغیرہ نے مشورہ کر کے ڈابھیل میں نئے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی اور حضرت شاہ صاحبؒ سے رفقاء سمیت تشریف لانے کی درخواست کی، جو طلبہ ان کے ساتھ دارلعلوم دیوبند سے ڈابھیل گئے، ان میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ بھی شامل تھے۔ وہیں آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

فقر و درویشی کی شادی

مولانا لطف اللہ پشاوری لکھتے ہیں:

''مولانا کی زندگی کا یہ دور بڑی آزمائش اور ابتلاء کا تھا، پشاور میں گھر کے تمام اخراجات جاری تھے، مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور جب والد صاحب کو خط لکھتے تو جواب آتا کہ بس عنقریب میں آنے والا ہوں اور تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ آپ کے چچا کی لڑکی جس کے ساتھ آپ کی نسبت ہو چکی تھی، اس کی اراضی بھی سید زکریا نے فروخت کر دی تھیں۔ جب مولانا کے والد ماجد کی کابل سے واپسی میں غیر معین تاخیر ہوگئی، تو مولانا عبدالحق نافع کے مشورے سے طے ہوا کہ مولانا کا

نکاح اب بہر صورت ہو جانا چاہئے۔ وہ عجیب و غریب رات مجھے نہیں بھولتی، جب مولانا کی بیٹھک میں مولانا کا نکاح پڑھایا۔ مولانا خود دولہا تھے اور خود ہی دوسری طرف سے وکیل تھے، خود ہی نکاح خواں تھے، میں اور مولانا عبدالحق ناقع گواہ تھے، شادی کے لئے اور اہتمام تو کیا ہوتا کوئی جوڑا بھی نہیں بنایا گیا، نہ دُولہا کے لئے نہ دُلہن کیلئے، بس بدن کے پہنے ہوئے کپڑے ہی جامۂ عروسی تھا۔ گھر میں دو سیر چاول تھے، وہ پکائے کھائے گئے، یہ مولانا کا ولیمہ تھا، گھر میں ایک چارپائی سالم تھی اور ایک ٹوٹی ہوئی، سوائے ہم دونوں کے کسی کو شادی کا پتہ بھی نہ چلا۔ یہ تھا مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی شادی کا نقشہ جن کی رحلت پر پورے عالم اسلام نے ماتم کیا۔ (ص ۲۷)

علم کا راز

مولانا لطف اللہ نے یہ بھی لکھا ہے:

مولانا بنوریؒ نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور جمعیت علمائے سرحد کو یتیم چھوڑ دیا۔ کراچی کے مدرسے میں جب میں ان کا رفیق تھا تو مولانا اکثر مجھ سے بطورِ شکایت فرمایا کرتے تھے کہ تم مجھے سیاست کی گندی گلی میں گھسیٹ کر لے گئے تھے، مگر دیکھو! میں تم کو علم کے بازار میں گھسیٹ کر لایا ہوں۔ (ص ۲۹)

علامہ طنطاویؒ سے تفہیم

علامہ کوثریؒ کے علاوہ مصر میں مولانا بنوریؒ کی ملاقات علامہ طنطاویؒ سے بھی ہوئی، انہوں نے اپنی تفسیر میں مختلف کواکب، مختلف

سمندروں کے موجودات اور نباتات وحیوانات سے متعلق علوم جدیدہ کو بھر دیا تھا۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں کسی جگہ آسمان کا ذکر آیا تو آپ نے ستاروں کے بارے میں جدید مغربی مصنفین کی تحقیقات ذکر کرنا شروع کر دیں، کسی جگہ مچھلی کا ذکر آیا، تو جدید مغربی ذرائع سے مچھلیوں کی جو اقسام دریافت ہوئی ہیں، ان کا تذکرہ شروع کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ دور جدید کے تمام اکتشافات قرآن سے مستنبط ہیں۔ کم علم لوگ ان کے اس کارنامے سے بہت مرعوب ہیں، حالانکہ یہ معلومات یورپ کے محققین کے اکتشافات ہیں، قرآن کے علوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ مولانا بنوریؒ نے علامہ طنطاویؒ سے فرمایا کہ آپ صرف ایک بات پر غور فرمائیں اور وہ یہ کہ علوم قرآن کا مخزن صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپؐ کے بعد وہ حضرات ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے قرآن کریم کا علم حاصل کیا تھا، کیا یہ معلومات جو قرآن کی تفسیر میں آپ نے درج کی ہیں، کبھی صحابۂ کرام کے ذہن میں ان کا تصور آیا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو ان علوم جدیدہ کو قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح بنا کر تفسیر قرآن کریم قرار دینا کس طرح صحیح ہے؟ قرآن کریم کا موضوع تو ہدایت ہے یعنی حق تعالیٰ کی مرضیات کی جانب بندوں کی راہنمائی کرنا۔ ان علومِ جدیدہ کا قرآن کریم اور مقصد نبوت سے کیا تعلق؟ علامہ طنطاویؒ نے ذرا غور کرنے کے بعد فرمایا کہ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں، آخر میں فرمایا: ''ما انت عالم هندی انما انت ملک نزل من السماء لاصلاحی'' گویا آپ فرشتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لئے بھیجا۔ اس واقعہ سے ایک طرف

طنطاویؒ کی بلند پایہ حق پسندی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا (خصوصاً ایک ایسے شخص کے لئے جس کے قلم سے دنیا مرعوب ہو) بڑا مشکل کام ہے اور دوسری طرف مولانا بنوریؒ کی عبقریت بھی اس سے ثابت ہوتی ہے کہ نوعمر عجمی ہونے کے باوجود اتنے بڑے آدمی کو قائل کرلیا۔ (ص ۳۵)

کیڑوں کو ہٹاتے رہے

''جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے آغاز میں ہم لوگ درخت کے نیچے درس دیتے تھے اور اس درخت پر سے ایک قسم کے کیڑے گرتے رہتے تھے، مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم ایک ہاتھ سے ان کیڑوں کو کتاب بخاری شریف سے ہٹاتے رہتے اور دوسرے ہاتھ سے بخاری شریف کا ورق اُلٹتے تھے''۔ (ایضاً ص ۴۰)

دوزخ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا

مولانا مرحوم کے تقویٰ اور خدا ترسی کا یہ حال تھا کہ زکوٰۃ فنڈ صرف طلبہ کے لئے رکھتے تھے، اس کو کبھی کسی حالت میں مدرسین کی تنخواہ یا مدرسہ کی تعمیرات یا کتابوں کی خرید پر صرف نہیں کرتے تھے، دوسرے سال مدرسہ کی حالت زکوٰۃ فنڈ میں قابل اطمینان ہوگئی۔ ایک دفعہ زکوٰۃ فنڈ میں ۲۵ ہزار روپیہ جمع تھا، مگر غیر زکوٰۃ کی مد خالی تھی، جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو خزانچی حاجی یعقوب صاحب نے کہا کہ مدرسین کے لئے کچھ نہیں، اگر آپ اجازت دیں تو زکوٰۃ فنڈ میں سے قرض لے کر مدرسین کی تنخواہ ادا کی جائے، بعد میں زکوٰۃ فنڈ میں یہ رقم لوٹا دی جائے گی۔

آپ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں! میں مدرسین کی آسائش کی خاطر دوزخ کا ایندھن بننا نہیں چاہتا۔ مدرسین کو صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے کہ ان کے فنڈ میں اللہ تعالیٰ کچھ بھیج دے۔ جو مدرس صبر نہیں کرسکتا، اس کو اختیار ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے''۔

جب کوئی ذی ثروت صاحبِ خیر مدرسہ کو چندہ دینے آتا تو مولانا اس سے فرماتے کہ ''مجھے زکوٰۃ کی ضرورت نہیں، یہ تو غسالۂ مال ہے، جسے اگلی امتوں میں آگ آسمان سے اُتر کر جلا دیا کرتی تھی۔ میرے مدرسے کے مدرسین کے لیے اگر کچھ دینا ہے تو غیر زکوٰۃ میں سے دو''۔

مدرسہ اور منتظمین

مولانا مرحوم مسجد کے منتظمین کو مدرسہ کے اندرونی معاملات میں دخیل ہونے کا موقعہ نہیں دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ اور تدریس کے امور صرف علماء راسخین ہی سمجھتے ہیں، غیر عالم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتا۔ (ایضاً ص ۴۲)

شیخ سے محبت

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ آپ کے خصوصی اور سب سے بڑے شیخ ہیں۔ ہمارے شیخ رحمہ اللہ اپنے شیخ کے سچے عاشق اور محبِ صادق تھے۔ ان کی ایک ایک ادا کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا، ان کی محبت سے آخر دم تک سرشار رہے اور کسی نہ کسی مناسبت سے اس انداز سے ان کا ذکر خیر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی شیخ سے مل کر آرہے ہیں، ان کے ملفوظات ایسے محفوظ کر رکھے تھے کہ ہو بہو انہیں

الفاظ میں بیان کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے: واللہ ہذ الفظہ، واللہ ہذا لفظہ۔ ان کے ذکر خیر کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر بُنِ مو سے اظہار تشکر و امتنان اور ہر لفظ و حرف سے محبت و عقیدت کا چشمہ اُبل رہا تھا آپ نے امام العصرؒ سے ہی اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کئے اور سب سے زیادہ فیض اٹھایا۔ سفر و حضر میں ان کے خادم اور ایک سال سے زیادہ عرصہ تک شب و روز ہمہ دم ان کے رفیق رہے۔ (ایضاً ص ۵۳)

خالق پر اعتماد

یہ صورتِ حال مدینہ منورہ میں قیام کے پندرہ روز بعد پیش آئی تھی جب حضرت شیخ رحمہ اللہ وطن واپس لوٹے تو فرماتے تھے، مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے کروں؟ تقریباً ایک سال تک اسی شش و پنج میں رہے کہ اس اثناء میں ایک صاحب ثروت شخص حاجی یوسف سیٹھی صاحبؒ (جنہوں نے اپنے آپ کو قرآن کریم اور دین کی تعلیم عام کرنے کیلئے وقف کر دیا تھا) تشریف لائے اور پچاس ہزار روپے کی پیشکش کی جو آپؒ اور مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ کے تقریباً پانچ سال کے مشاہرہ کے لئے کافی ہوتا اور عرض کیا کہ مدرسہ کھول کر معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر کام کریں، لیکن حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اسے توکل و اخلاص کے منافی سمجھتے ہوئے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مدرسہ کی بنیاد رکھنے سے قبل کسی کی معاونت و مساعدت قبول نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا بھروسہ اس پیسہ پر ہوگا خدا کی ذات پر نہیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے لئے کام کریں اس پر بھروسہ کریں، جب ہم اس کے لئے

کام کریں گے تو وہی ہماری تمام ضروریات کا کفیل ہوگا۔

حضرت شیخ قدس سرہٗ جتنا انکار کرتے سیٹھی صاحب اتنا ہی اصرار کرتے رہے، لیکن چونکہ آپ کا خدا کی ذات پر اعتماد نہایت قوی تھا وہ اس کو توکل کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اسے ٹھکراتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ مایوس ہوئے تو انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا ''سُن دائیں'' مقصد یہ تھا کہ عجیب آدمی ہیں، پیسہ پاس نہیں اور پھر بھی اتنی خطیر رقم کو اس طرح ٹھکرا رہے ہیں، انہیں کیا معلوم تھا کہ ٹھکرانے والا کون ہے؟ وہ بظاہر گدائے بے نوا ہے، مگر توکل وقناعت جیسے بے بہا خزانے کا مالک ہے یہ وہ بے تاج بادشاہ ہے جو دلوں پر حکومت کرتا ہے، مخلوق کے بجائے خالق پر اعتماد رکھتا ہے۔ (ایضاً ص ۵۶)

نصائح کا نچوڑ

زمانۂ طالب علمی میں راقم الحروف ایک مرتبہ سفر میں تھا، عریضہ ارسال خدمت کیا، جس میں کچھ نصیحت کی درخواست بھی پیش کی، جواب آیا اور ایسی عمدہ، قیمتی اور بہترین نصیحت پر مشتمل جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، تحریر فرمایا:

''دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے سوا کسی سے کسی خیر کی توقع نہ کریں اور نہ کسی پر اعتماد و توکل کریں ورنہ سوائے خسران وناکامی کوئی اور نتیجہ نہ ہوگا''۔ (ایضاً ص ۵۷)

اخلاص، توکل واستغناء

اخلاص وتوکل اللہ تعالیٰ نے اتنا اعلیٰ عطا فرمایا تھا کہ فرمایا کرتے

تھے کہ ہمیں سفیر، جلسہ، اشتہار و اعلان کی ضرورت نہیں، جس کا مدرسہ ہے وہ خود چلائے گا، چنانچہ مخلص حضرات خود آ کر چندہ دے جاتے تھے، کوئی سفیر تھا نہ اپیل، حتیٰ کہ ہمارے شیخ رحمہ اللہ بعض مرتبہ تو زکوٰۃ دینے والوں سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا سال بھر کا انتظام ہو چکا ہے، آپ کسی دوسرے مدرسہ کو دے دیں، بعض مرتبہ خود لے کر کسی دوسرے مدرسہ کو دے دیتے، کتنے مدرسے ایسے تھے جن کی امداد خود ہی فرمایا کرتے تھے نہ حکومت سے مدد لیتے نہ اوقاف سے نہ ہی کسی اور سرکاری و غیر سرکاری ادارہ سے۔ بھروسہ تھا تو صرف خدا کی ذات پر، وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے وہ دلوں کو اس طرح پھیر دیتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ لوگ پیسے دے رہے ہیں اور شیخ رحمہ اللہ استغناء سے واپس فرما رہے ہیں کہ ہمیں زکوٰۃ کی ضرورت نہیں یہ بھی کوئی پیسہ ہے، تمہارا ہم پر احسان نہیں کہ زکوٰۃ دے رہے ہو بلکہ ہمارا تم پر احسان ہے کہ تمہارے پیسے کو قبول کرتے ہیں اور صحیح جگہ پر لگاتے ہیں، کسی سے فرماتے کہ یہ زکوٰۃ کا پیسہ اس وقت قبول کریں گے جب کہ اتنی ہی مقدار میں غیر زکوٰۃ کا پیسہ دو، جب وہ صاحب حامی بھر لیتے تو قبول کر لیتے۔ (ایضاً ۶۲)

شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت مولانا بنوری قدس سرہٗ العزیز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بڑے مداح تھے، بار بار اپنے دروس اور مجالس میں فرمایا کرتے تھے:

''اگر کسی شخص کو آنکھیں بند کر کے مقتدیٰ اور امام بنایا جا سکتا ہے تو وہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہیں، کیونکہ حضرتِ موصوف علم ظاہر و باطن کے جامع اور فقہ و کلام میں مسلک اعتدال کے حامل تھے''۔

ایک صاحب مصر کی الازہر یونیورسٹی سے علوم قرآنی میں تخصص کر کے آئے تو اُن سے دریافت کیا کہ نسخ کی مختلف صورتوں کی حکمت پر روشنی ڈالئے، جب وہ عاجز ہوئے تو فرمایا کہ :

''حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف صورتوں کی حکم و مصالح اس طرح تحریر فرمائی ہیں کہ کہیں کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئیں''۔

اپنے شیخ انور شاہ کشمیریؒ کا قول نقل کرتے تھے :

''حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر ''فتح العزیز'' مکمل ہو جاتی تو کسی تفسیر کی حاجت نہیں رہتی''۔

حضرت بنوریؒ امام بخاریؒ کی کتاب کے الابواب والتراجم کے متعلق فرمایا کرتے تھے :

''اگر اس طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ توجہ فرماتے تو حق ادا ہو جاتا''۔(ایضاً ص ۱۰۲)

استاذ سے کمال محبت

حضرت مولانا اپنے استاذ کا ادب و احترام فرماتے اور ہر شخص کے کمالات کے معترف تھے اور فروق بین الرجال کے تو امام تھے۔ شخصی تحلیل و تجزیہ میں کمال رکھتے تھے، لیکن عالم کامل صرف حضرت شاہ صاحب کو سمجھتے تھے۔ اُن کے نبوغ، کمال فی العلم، حذاقت کے سامنے ان کی نگاہ میں کوئی نہیں تھا۔ حضرت محدث کشمیریؒ کے تذکرہ سے ان کی محفلیں آباد رہتی تھیں۔ انہیں کا تذکرہ زبان پر جاری رہتا تھا، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ مجھ سے کوئی انور شاہؒ کے متعلق پوچھے تو میں کہوں گا

(عالماً صالحاً) کے معنی یہ ہوں گے، کان غیرہ لیس بعالم محدث کشمیری کے متعلق یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ آپ کو کن علوم میں امامت کا درجہ حاصل تھا تو میں کہوں گا (۱) عربیت (۲) فقہ ان دونوں میں امام سمجھتے تھے۔ الغرض مولانا نے اپنی نظر میں صرف انور شاہ ہی کو پوری طرح سمولیا تھا اور وہی ان کے یہاں مثالی شخصیت تھی۔ دوسری شخصیت جن سے مولانا متاثر تھے، وہ علامہ محمد زاہد الکوثری تھے۔ (ایضاً ص ۱۱۲)

علامہ انور شاہؒ اور مطالعہ

صحیح بخاری، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور صحیح مسلمؒ حضرت شیخ الہند سے پڑھیں۔ صحیح بخاری نہایت ہی اہتمام سے پڑھی کہ بخاری شروع ہونے سے قبل عمدۃ القاری للعلامہ العینی رمضان اور شوال کی ابتدائی تاریخوں میں پوری ختم کرلی اور اس کے ساتھ ساتھ فتح الباری للحافظ ابن حجر کا مطالعہ شروع کردیا، عموماً مطالعہ درس کے ساتھ ہی ساتھ چلتا، شاہ صاحب فرماتے تھے کبھی کبھی مطالعہ درس سے زیادہ ہوجاتا۔ ایک مرتبہ سترہ (۱۷) روز بیمار رہا۔ بڑی فکر ہوئی لیکن جب درس میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا مطالعہ جہاں پہنچا تھا درس وہاں تک ابھی نہیں پہنچا۔ حضرت بنوریؒ کے الفاظ ہیں:

ولکن لما حضرت فی الدرس رأیت انہٗ لم یصل الدرس الیٰ موضع بلغت الیہ مطالعتی. (نفحۃ العنبر ص ۴۹)

(لیکن جب میں درس میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ درس ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا جہاں تک میرا مطالعہ پہنچ چکا تھا)۔ (ایضاً ص ۱۱۵)

کمال حافظہ ومطالعہ

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ فتح القدیر جیسی کتاب جو فقہ و حدیث، اصول، جدل و خلاف میں بے عدیل کتاب ہے۔ ۱۳۲۱ھ میں بیس سے کچھ اوپر دنوں میں مطالعہ کی تھی اور کتاب الحج تک تلخیص بھی کی تھی اور کمال ابن الہمام نے صاحب الہدایہ پر جو اعتراضات کئے تھے، اُن کے جوابات بھی دیے تھے۔ یہ سب کچھ بیس سے زیادہ دنوں میں کیا، پھر کبھی مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب ۱۳۴۷ھ میں دورۂ حدیث کے درس میں اس کتاب کا حوالہ دیا تو فرمایا:

''چھبیس (۲۶) سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا، اگر مراجعت کرو گے تفاوت کم پاؤ گے''۔ (فیض العنبر ص ۲۶)

مسندِ احمد کا مطالعہ شروع کیا۔ تمام مشاغل کے ساتھ دو سو صفحے روزانہ مطالعہ کا اوسط تھا۔ سرسری نہیں بلکہ متون واسانید تفکر و تدبر اور حل مشکلات کے ساتھ۔ پھر اس کے ساتھ بیان فرماتے، دوسری مرتبہ پھر اس کتاب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی احادیث جمع کرنے کیلئے مطالعہ کیا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ حضرت محدث کشمیریؒ کا قول نقل فرماتے تھے:

اذا طالعت کتاباً مرتجلاً ولم ارد ادخار مباحثه یبقی فی حفظی الی نحو خمس عشرة سنة.

جب میں کسی کتاب کو جلدی میں دیکھتا ہوں اور اس کے مباحث محفوظ رکھنے کا ارادہ نہیں ہوتا تو میرے حافظہ میں اس کے مباحث پندرہ سال تک باقی رہتے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۱۷)

امام طحاویؒ اور حضرت بنوریؒ

''۲ر ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ بروز منگل بعد از نماز عصر عقب مسجد کے سبزہ زار میں شرح معانی الآثار پر کام کی مناسبت سے محقق العصر حضرت الاستاذ الشیخ البنوریؒ نے فرمایا: امام طحاویؒ بڑے وسیع النظر انسان ہیں ہر موضوع پر اتنا مواد جمع کر کے پیش کرتے ہیں کہ عقل حیران ہے۔ آپ نے جو علمی سامان فراہم کیا ہے اس کی اگر تنقیح ہو جائے تو حنفیہ کیلئے کافی ثابت ہو، چند مباحث میں کمی نظر آتی ہے۔ ان کی تکمیل حضرت محدث کشمیریؒ کے علوم و معارف سے کی جا سکتی ہے۔ امام طحاوی کے پایہ کا آدمی کہیں نظر نہیں آتا نہ دار قطنی ان کے مقام تک پہنچ سکتا ہے نہ خطیب، نہ بیہقی نہ کوئی اور۔ البتہ ان تینوں حضرات کو ملا کر اگر ایک پلڑے میں ڈالا جائے تو امام طحاویؒ کے برابر ہوں گے، لیکن پھر بھی روایت کے لحاظ سے امام طحاویؒ کا پلہ بھاری رہے گا۔ اس لئے کہ طحاویؒ کی عقلیت بے نظیر ہے۔ وہ حدیث میں بھی چلتی ہے، تفسیر میں بھی اور کلام میں بھی، حالانکہ مذکورہ بالا تینوں شخصیتوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر بڑی بھاری شخصیت ہے۔ طحاویؒ کے بعد پھر حنفیہ میں ایک ہزار سال تک کوئی ایسا آدمی نہیں آیا۔ جس نے امام طحاویؒ کے فراہم کردہ علوم پر اضافہ کیا ہو، الا مولانا محمد

انور شاہؒ ..... کہ ان کے ہاں یہ اضافے ملتے ہیں، علامہ ماردینی کے پاس کچھ زوائد وفوائد ہیں۔ بیہقی وغیرہ پر گرفت کرتے ہوئے بعض قابلِ قدر چیزیں ذکر کی ہیں۔ ان کے شاگرد حافظ زیلعیؒ کے پاس اگرچہ کافی سامان ہے، مگر استعمال میں نہیں لائے۔ رہے ابن الہمامؒ تو ان کی فتح القدیر ابن حجر کے استدلال کا جواب فراہم نہیں کرسکی۔ بہت کچھ لکھا ہے، مگر فتح القدیر کا توڑ نہیں۔ حافظ بدر الدین العینیؒ نے بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کے کلام میں زور نہیں ہے۔ ہمارے اکابر دیوبند توجیہات کے باب میں بہت آگے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اوران کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے بہترین توجیہات پیش کی ہیں، جب کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد حضرت گنگوہیؒ وہ واحد شخص ہیں، جنہوں نے محض اپنے نورِ قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی اس سے ملا۔ ان حضرات کی توجیہات اپنی جگہ بہت اہم اور وقیع ہیں لیکن مخالف پر حجت نہیں بن سکتیں۔ احادیث کے ذخیرہ میں سے اتنا مواد جمع نہیں کیا کہ غیر پر حجت بن سکے۔ یہ کام حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے کیا ہمارا ارادہ ہے کہ امام طحاویؒ کی بحث جن مسائل میں ناکافی ہے وہاں تعلیقات کی صورت میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم سے استفادہ کرکے اضافہ کریں۔ یہ بہ یک وقت دین، حدیث اور حنفیت کی بڑی خدمت ہوگی اور اپنے مسائل پر حنفیہ کے لئے بھی کچھ کافی رہے گا''۔ (ایضاً ۱۲۱)

عظیم شہادت

حضرت شاہ صاحبؒ کی حدیث اور علومِ حدیث میں یہی خصوصیات تھیں، جنہوں نے ان کو مسندِ وقت اور امام بنا دیا تھا۔ حضرتؒ کی وفات پر حضرت محقق شبیر احمد عثمانیؒ نے تعزیتی جلسہ میں جو دل ہلا دینے والی تقریر کی تھی اس میں فرمایا تھا:

''اگر تم مجھ سے پوچھو کہ تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ تقی الدین بن دقیق العید، سلطان العلماء عز الدین بن عبدالسلام رحمہم اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا تو اگر میں ہاں کہہ دوں تو سچا ہوں گا، کیونکہ میں نے انور شاہ کو دیکھا تھا، کیونکہ اگر انور شاہ ان علماء کے دور میں ہوتے یوں ہی ہوتے''۔ (نفحة لعنبر، عربی سے ترجمہ)

فنافی الشیخ

حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی لکھتے ہیں:

''مدرسہ عربیہ اسلامیہ سے تعلق اور وابستگی کے ابتدائی کسی سال میں ایک دن اپنی نشستگاہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تنہا تشریف فرما تھے میں کسی سلسلہ میں حاضر تھا، سلسلۂ گفتگو تو مجھے یاد نہیں، بہر حال میں نے عرض کیا، حضرت! میری آپ سے وابستگی کا راز صرف یہ ہے کہ میں آپ کے آئینہ میں اس محبوب ہستی کا عکس دیکھتا ہوں جس سے مجھے انتہائی محبت ہے۔ حضرت مولانا یہ سن کر خاموش ہو گئے اور حقیقت ہے کہ میں آپ کی بیشتر مجلسوں میں صرف حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی باتیں

آپ کی زبان سے سننے کے لئے بیٹھا تھا، کیونکہ آپ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی باتوں کا ٹیپ ریکارڈر تھے، بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ ہی بول رہے ہیں اور جب تک حضرت مولانا، شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی باتیں نقل کرتے رہتے، انتہائی محویت اور کیف وسرور کے عالم میں سنتا رہتا اور جب آپ کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے تو تکدر کے ساتھ بیٹھا رہتا یا اٹھ کر چلا آتا اور جب حضرت مولانا مکان سے آہستہ آہستہ مدرسہ تشریف لاتے اور میں دور سے آپ کو دیکھتا تو بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے شاہ صاحب خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۸۰)

ذوقِ مطالعہ

''جب ہدایہ پڑھتا تھا تو فتح القدیر، البحر الرائق اور بدائع۔ ان تینوں کتابوں کا دو سبق کے قریب مطالعہ کرلیا کرتا تھا اور میرا مطالعہ ہمیشہ استاذ کے سبق سے آگے رہتا تھا۔ پھر مشکوٰۃ شریف کے سال بدایۃ المجتہد اور حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت نصیب ہوئی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس مذاہب اربعہ کی کتابیں تھیں۔ چنانچہ میں کتاب الأم للشافعی، المغنی فقہ حنبلی اور المجموع شرح مہذب وغیرہ کا مطالعہ کرتا تھا، جس سے مجھے شوق پیدا ہوا اور میں نے مذاہب اربعہ کی اکثر کتب متداولہ کا مطالعہ کیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ یہ تمہارے اندر مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے سنا

رہا ہوں''۔ (ایضاً ص ۱۸۲)

بے انتہاء قربانی

ابتلائی دور میں اہل وعیال کا بغیر کسی ظاہری سہارے کے تنہا ٹنڈو اللہ یار میں رہنا ہی حضرت بنوریؒ کے لئے کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔ ابتلاء پر ابتلاء یہ پیش آیا کہ وہاں کے کمینہ خصلت وکینہ پرور کم ظرف افراد نے حضرت کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل خانہ کو طرح طرح سے پریشان کیا، حتیٰ کہ گھر میں سبزی، ترکاری وغیرہ بھی پہنچانا مشکل بنا دیا۔

اسی عالم میں حضرت کی صاحبزادی موحومہ فاطمہ بہن کی آنکھوں میں کوئی شدید تکلیف پیدا ہوئی ادھر حضرت کراچی میں مدرسہ کے کاموں میں مصروف اور مشکلات میں سرگردان، ادھر مرحومہ اپنی والدہ محترمہ کے پاس ٹنڈو اللہ یار میں محبوس، نہ کوئی تیماردار اور نہ کوئی دوا، نہ علاج کرنے والا موجود۔ ایسی حالت میں ہسپتال لے جا کر مرض کی تشخیص کرانے کی طرف توجہ کون کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آنکھوں کی بینائی بالکل جاتی رہی۔ جب اہل خانہ کراچی منتقل ہوئے اور ماہرین چشم سے معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ بینائی بالکل جاتی رہی ہے اور علاج کے مرحلہ سے گزر چکی ہے۔ اب ٹھیک ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

حضرتؒ کو مرحومہ سے اس کی دین داری، صلاح وتقویٰ اور معذوری وبے چارگی کی وجہ سے بے حد محبت تھی۔ رو رو کر فرماتے تھے کہ اسی دینی مدرسہ کے لئے ہم نے اپنی عزیزہ لخت جگر کو بھی قربان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہماری قربانی قبول فرمائیں اور جس عظیم مقصد کے لئے ہم نے

اپنے آپ کو، اہل وعیال کو قربان کیا ہے اپنی رحمت سے اس مقصد میں ہمیں کامیاب فرمائیں۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

اسمعت من ناجیت

چنانچہ حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں دو باتوں پر کامل یقین ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ ایک تو یہ کہ مال و دولت کے تمام خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اور دوسرا یہ کہ اولاد آدم کے قلوب بھی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم اخلاص کے ساتھ صحیح کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ بندوں کے قلوب خود بخود ہماری طرف متوجہ کر کے اپنے خزانوں سے ہماری مدد کرے گا۔ ہمیں کسی انسان کی خوشامد کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا جو ضرورت ہمیں پیش آتی ہے ہم اللہ تعالیٰ سے کہتے اور مانگتے ہیں۔ وہ ایسی جگہ سے ہماری ضرورت کو پورا کرتا ہے جہاں ہمارا گمان بھی نہیں ہوتا، پھر ہم کیوں کسی انسان کے سامنے ہاتھ پھیلائیں یا کسی کی خوشامد کریں۔ اسی تعلق مع اللہ کے غلبہ کی بناء پر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ کے یہ کلمات بے انتہاء پسند ہیں اور اسی پر میرا عمل ہے ''اسمعت من ناجیت''۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی رات میں اٹھ کر اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حالتِ عبادت کا جائزہ لیا۔ سیدنا حضرت صدیق اکبر، سیدنا حضرت فاروق اعظم اور سیدنا حضرت بلال وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو عبادت کرتے دیکھا، ہر ایک کی شانِ عبادت دوسرے سے مختلف تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نماز میں نہایت آہستہ آہستہ آواز میں

قرآن کریم پڑھ رہے ہیں۔ صبح کو صدیق اکبرؓ سے دریافت کیا کہ آپ آہستہ آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا ''اسمعت من ناجیت'' جس سے سرگوشی کر رہا تھا، اسی کو سنا رہا تھا، تو ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ جس کے لئے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں اسی کو ہم اپنا حال سناتے ہیں اور اسی سے ہم مانگتے ہیں، کسی اور سے ہمیں کیا واسطہ۔ یہی نصرتِ خداوندی پر پختہ یقین و اعتماد اور شہرت سے بیزاری اور نفرت اس کا باعث بنی کہ موصوف نے زمانے میں شہرت اور پروپیگنڈے کے جتنے وسائل ہیں، ان سے نہ صرف احتراز فرمایا بلکہ ان کو روح اخلاص اور للّٰہیت کے قطعی منافی سمجھا۔ (ایضاً ص ۲۲۶)

ورنہ مدرسہ بند کر دیں گے

فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے جس کے لئے مدرسہ قائم کیا ہے اس کو سب کچھ معلوم ہے، وہ خود ہی جب اور جس طرح چاہے گا اسباب و وسائل پیدا فرما دے گا۔ نیز فرماتے تھے کہ ہم تو صرف صحیح کام کرنے کے ہی مکلف ہیں، اگر صحیح طریق پر مدرسہ نہ چلا سکیں گے تو بند کر دیں گے، ہم کوئی دین کے ٹھیکیدار نہیں ہیں کہ صحیح یا غیر صحیح، جائز یا ناجائز جس طرح بھی ممکن ہو مدرسہ جاری رکھیں، ہم تو غیر صحیح اور ناجائز ذرائع اختیار کرنے کی بہ نسبت مدرسہ کو بند کر دینا بہتر بلکہ آخرت کی مسئولیت کے اعتبار سے ضروری سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۲۷)

اخلاص

فرماتے تھے کہ ایک شخص اپنے اخلاص کی بدولت الف، با، پڑھا

کر جنت میں جا سکتا ہے اور دوسرا اخلاص کے بغیر بخاری پڑھا کر اس سے محروم رہ سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۴۵۶)

نماز کا اہتمام

نماز کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ لوساکا (زمبیا) ائرپورٹ سے جب شہر کی طرف روانہ ہوئے تو وہاں کے حضرات نے عرض کیا کہ عصر کی نماز شہر میں پہونچ کر پڑھیں گے، مگر ائرپورٹ شہر سے کافی دور تھا۔ جب راستہ میں دیکھا کہ سورج کے متغیر ہونے کا خطرہ ہے تو سختی سے موٹریں رکوادیں اور اتر کر تیمم فرمایا اور ایک طرف گھاس پر باجماعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ اب اطمینان ہو گیا۔ (ایضاً ص ۴۵۹)

قصیدہ بردہ کا شعر

دورانِ سفر ہوٹل یا کسی دفتر میں اترتے چڑھتے وقت جب لفٹ کے لئے بٹن دباتا اور لفٹ آجاتی تو آپ قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھتے۔

جاءت لدعوته الأشجار ساجدة

تمشی الیه علی ساق بلا قدم

(ایضاً ص ۴۶۱)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

شاہ صاحب جتنے عظیم تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی اسارتِ مالٹا کے موقع پر ان کی مسند پر آپ کو بٹھلایا گیا اور بٹھلانے والوں میں آپ کے بڑے اور اساتذہ بھی شامل تھے۔ حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا یہ کہنا کہ ''انور شاہ کا وجود اسلام کی حقانیت

کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے''۔ بلا وجہ نہیں، حضرت العلامہ مولانا عثمانی مرحوم پچھلے ادوار کی عظیم علمی شخصیات کا حوالہ دے کر فرماتے کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم نے حافظ ابن حجر اور فلاں فلاں بزرگ عالم کو دیکھا تو میں اس لئے ہاں کردونگا کہ میں نے علامہ کاشمیریؒ کو دیکھا ہے۔ مولانا احمد سعید دہلوی نے اُن کے تعزیتی جلسہ میں انہیں چلتی پھرتی لائبریری کہا۔ خطیب مکرم السید عطاء اللہ الحسینی البخاری نے یہاں تک فرمادیا کہ صحابہؓ کا قافلہ چلا جارہا تھا، انورشاہ بچھڑ گئے اور علامہ السید رشید رضا مصری نے اختلاف مسلک کے باوجود جو تأثر لیا وہ ''المنار'' میں چھپا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میں دیوبند کو نہ دیکھتا تو غم زدہ واپس جاتا اور اس کا سبب اس دور میں علامہ انورشاہ کاشمیریؒ کی علمی سیادت تھی۔

(ایضاً ص ۶۱۴)

حدیث موت وفراق

صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''عش ما شئت فانک میّت و أحبب من شئت فانک مفارقہٗ''۔ جتنا چاہو جی لو مگر تمہیں بہرحال مرنا ہے اور جس سے چاہو دل لگالو مگر تمہیں اس سے جدا ہونا ہے''۔ (ایضاً ص ۷۷۱)

القاسم اکیڈمی کی ایک اور عظیم تاریخی پیشکش

سوانح قائد اہل سنت، وکیلِ صحابہؓ، مظہرِ شریعت وطریقت

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بانی تحریک خدام اہل سنت پاکستان

خلیفہ مجاز شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ

جس میں آپ حضرت قاضی صاحب موصوف کے زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں، تبلیغی واصلاحی باتیں، حلقۂ ذکر، دعوتی اور واعظانہ خطابات اور ان جیسے سینکڑوں عناوین ملاحظہ فرمادیں گے۔ ان شاء اللہ عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

ناشر

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد پاکستان

القاسم اکیڈمی کی تازہ ترین پیش کش

اماں جی مرحومہ ومغفورہ

تحریر !

مولانا عبدالقیوم حقانی

مولانا عبدالقیوم حقانی کی سحر انگیز قلم سے ایک حیرت انگیز' روح پرور اور ایمان افروز داستانِ عبرت جسے پڑھ کر پتھر دل نرم اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ایک ایسی داستان' جو سبق آموزی میں سب کے لئے یکساں ہے۔چار رنگہ کمپیوٹرائزڈ خوبصورت ٹائٹل، شاندار طباعت، مضبوط جلد بندی اور نفیس کاغذ میں چھپ کر منظر عام پر آ گئی ہے۔خواہشمند حضرات القاسم اکیڈمی سے طلب کر سکتے ہیں۔

صفحات : 135 .....

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوھریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

مولانا عبدالقیوم حقانی کی تصنیفات